بیاد

سلطان القلم حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

اکابر کی روایتوں کا پاسدار، قدیم وجدید تحریروں کا حسین امتزاج

ماھنامہ

# المناظر

مدیر

محمد سعید اللہ قاسمی مہراج گنجی

معاون مدیر

محمد فہیم قاسمی گورکھپوری

مرکز اشاعت

حکیم الاسلام لائبریری

بیلی پار، گورکھپور، یوپی، انڈیا

بیاد:۔ سلطان القلم حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ

اکابر کی روایتوں کا پاسدار، قدیم وجدید تحریروں کا حسین امتزاج

ماہنامہ

جلد ۲ شمارہ ۵/۶

المناظر رابطہ نمبر/ 7905991793 ای میل: mahnamaalmanazir@gmail.com

مرکز اشاعت

حکیم الاسلام لائبریری بیلی پار، گورکھ پور، یوپی، پن نمبر ۲۷۳۴۱۳

# آئینہ اوراق

# خوشی کا احساس

خوشی اور مسرت کے لئے یہی نہیں ہے کہ مال و دولت کی بہتات، عیش و آرام کے لئے سامان آسائش، پہننے کے لئے قیمتی ریشمی کپڑے، چلنے پھرنے کے لئے چمکتی پھسلتی گاڑیاں میسر ہوں، بلکہ حقیقی خوشی تو کلمہ کی سر بلندی و سرفرازی کی خوشی ہے کہ ایوان وکفر وشرک میں سجدے خالق عالم کے کئے جائیں، ظلمت و تاریکی سے بھرے قلوب معرفت الٰہی سے چمکنے لگیں، گناہوں کے دلدل میں پھنسے اور ڈوبے لوگ نیکیوں کی شارع عام پر چلنے پھرنے لگیں، آفتاب و ماہتاب کے پرستاروں کو یہ یقین ہو چلے کہ ان کا طلوع اور غروب کسی کے قبضہ میں ہے، نجوم وسیارات کے سامنے پیشانیاں خم کرنے والوں کو اعتماد ہو جائے کہ انہیں آسمانوں میں چراغوں کے مثل ٹانگنے والا کوئی اور ہے، بتوں کو پوجنے والو کو علم ہو جائے کہ نفع اور نقصان کے مالک روزی دینے اور روکنے کی قوت ان میں نہیں ہے، کوئی اور ہے جس کے قبضہ میں دن اور رات کی تبدیلی ہے، یہ ایسا احساس ہے کہ کہنے والے نے کہا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آج سے پہلے تک آپ کے چہرہ سے برا کوئی چہرہ نہ تھا اور آج کا دن ہے کہ آپ کے چہرے سے خوبصورت اور محبوب کوئی چہرہ نہیں ہے۔ حقیقی خوشی تو دین ہی خوشی ہے ایمان کے ملنے کی خوشی ہے، اور حقیقی غم بھی یہی ہے کہ ہماری زندگی ان عظیم نعمتوں کے احساس سے خالی ہو۔

آیا صوفیا جس میں، سلطان محمد فاتح نے طاقتور عیسائیوں کو شکست دے کر اوران کے اوہام و خیالات توڑ کر مالک حقیقی کے سجدے کئے تھے، آزاد خیال، انگریز نواز، شریعت بیزار مصطفیٰ کمال اتاترک نے اسلام دشمن طاقتوں کے زیر اثر ۱۹۳۵ء میں بدقسمتی سے عجائب گھر میں تبدیل کر دیا تھا، بحمد للہ آٹھ دہائی بعد ترکی کے موجودہ صدر رجب طیب اردگان کی زیر قیادت اسے پھر عبادت الٰہی کے کے کھول دیا گیا ہے۔

یقیناً یہ خوشی اور مسرت کا دن ہے اور پورے عالم اسلام میں خوشی منائی گئی اور خوب منائی گئی، آیا صوفیا کی افتتاحی تقریب میں تقریبا ساڑھے چار گھنٹے تک لوگ عبادت الٰہی میں مصروف رہے، روتے رہے اور کہتے رب دو جہاں ہمارے کمزور ہاتھوں میں وہ قوت کہاں کہ ہم یہ معرکہ سر کر سکتے، وہ

طاقت کہاں کہ ہم یہ موقع فراہم کر سکتے۔لاحول ولاقوت الا باللہ۔

اندازہ کیا جا سکتا اس خوشی کا! ایک پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی خوشی کا! کہ خانہ کعبہ جو بتوں کی عبادت گاہ، شرک و بت پرستی کی آماجگاہ بن گیا تھا، خدا کا پیغمبر اپنے ہاتھوں سے اس خانہ خدا کو پاک کر رہا ہے، اور پڑھتا جاتا ہے، **جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا**۔باطل مٹ گیا اور یہ مٹنے ہی کی چیز ہے۔آج آیا صوفیا کی شکل میں ایک اور خانہ خدا اللہ کے بندوں کی عبادت وریاضت کے لئے صاف و پاک ہو گیا۔

لیکن اس خوشی کے ساتھ ہی ہوشیار، مستعد اور تیار رہنا ہے کہ مقابلہ اس قوم سے ہے جو انتہائی عیار و چالاک، ماہر مکر و فریب ہے، جو اپنی شکست کو بھولتے نہیں اپنی تاریخ کو فراموش نہیں کرتے، اپنے ماضی کے زخموں کو مندمل نہیں ہونے دیتے، انہیں کرید کر اس کی درد اور ٹیس کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور وقت ملنے پر انتقام کی ساری حدیں پار کر جاتے ہیں، جس کی مثال اندلس کی آٹھ سو سالہ شان و شوکت کی حکمرانی کے بعد اس کا سقوط ہے، جس کے بارے میں وقت کے مؤرخ نے لکھا ’’جتنی اجنبیت مجھے اندلس میں محسوس ہوئی کہیں نہ محسوس ہوئی‘‘۔ اور جس کی مثال خود یہی ترکی ہے جہاں آیا صوفیا موجود ہے۔

اس کی خوشی بندہ کو بھی ہے ہر صاحب ایمان شخص کو ہوگی۔اللہ قیام قیامت تک اسے مسجد کی شکل میں ہی باقی رکھے۔آمین

آیا صوفیا کا مسجد میں تبدیلی کی خوشی کے ساتھ ہزاروں مسجدوں کی ویرانی کا افسوس اور غم بھی ہونا چاہئے، ہوگا بھی، بیت المقدس، جامع قرطبہ، بابری مسجد۔یہ وہ مسجدیں ہیں جن کو تاریخی حیثیت حاصل ہونے کے ساتھ ہی عوام کی توجہ کا مرکز بھی ہیں۔ان مساجد کے علاوہ بھی مختلف ممالک میں سینکڑوں مسجدیں ایسی ہیں جو ویران اور غیر آباد ہیں۔

تین سال پہلے دہلی جانا ہوا جہاں تاریخی مقامات بھی دیکھنے گیا، ہمایوں کا مقبرہ بھی دیکھا خوب چل پھر کر دیکھا، خوبصورتی، صناعی اور کاریگری میں وہ مجھے دہلی کے دیگر تاریخی مقامات میں کہیں زیادہ خوبصورت اور حیرت انگیز معلوم ہوا، اسی میں ٹہلتے ایک ویران عمارت کے پشت کی طرف سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے صحن میں آیا، پیڑ سے پتنگ نکالتے چند بچوں نے کہا: جوتے نکال دیجیے، یہ مسجد ہے، یہ سننا تھا کہ اس ویران جگہ کہ عظمت و پاکیزگی کے خیال نے جوتے ہی نہیں بلکہ

مجھے ہی باہر ڈھکیل دیا پھر دیر تک صحن کے سامنے سے اس ویران مسجد کو دیکھتا رہا اور دیر تک دل محزوں اپنی کوتاہیوں پر آنسو بہاتا رہا کہ ایسی مسجدوں میں اگر سجدے کے لئے پیشانیاں نہیں جھک سکتیں تو کم از کم ان کے تقدس کی بحالی ہی کی موثر کوششیں ہوتیں، (کوششیں ہوئی بھی ہیں) اندر پہنچا، دیکھا، محراب اور دیواروں پر قرآنی آیات کے خوبصورت نقش ونگار کے پلاسٹر ادھڑ گئے تھے، قرآنی آیات کے نشانات بھی اکثر مٹ گئے تھے، یہ ویران مسجدیں ہمارے لئے بیت المقدس، جامع قرطبہ اور بابری مسجد سے کم نہیں ہیں۔ اللہ تعالی ایسی تمام مساجد کو سجدوں سے آباد کرے۔ آمین

☆---☆---☆

## اس زمین میں سمائے ہیں آسماں کیا کیا!

چندمہینوں سے چل چلاؤ کا ایسا دور چل پڑا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب صور پھونک دی جائے گی، بساط زمین لپیٹ دی جائے گی اور جب وقت آ پہنچے گا اس ہولناک اور خوفناک دن کا، تو صور پھوں کی بھی جائے گی اور بساط زمین لپیٹی بھی جائے گی۔ اس دن دنیا کے طاقتور حکمرانوں پر بھی وہی کیفیت طاری ہوگی، جو ایک کمزور وناتواں شخص محسوس کرے گا؛ مگر اس واقعہ سے پہلے ہی جو لوگ ملک عدم کے راہی ہوگئے، ان کی قیامت تو اسی دن قائم ہوگئی، جس دن موت کے فرشتے نے ان کی سانسوں کو روک دیا اور ان کی روحوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

جانے والوں میں علم وعمل، فضل وکمال اور زہد وتقویٰ سے آراستہ ایسی شخصیات بھی ہمارے درمیاں سے اٹھ گئیں، جو علم وکمال کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور دمکے۔ مشرق و مغرب میں جن کے علوم کا چرچا اور شہرہ رہا، جن کے علمی فیض کا دریا، تشنگان علوم نبوت کو برسوں سیراب کرتا رہا، جانے کو تو لوگ روز جاتے ہیں ایسے بھی جاتے ہیں جن کے جانے سے چند لوگوں کی دنیا اجڑتی اور ویران ہوتی ہے، ایسے بھی جاتے ہیں جو اپنے ساتھ ہی ایک عالم کو یتیم وغمگین کر جاتے ہیں، ایسے ہی جانے والوں میں مشہور شخصیت، عالم اسلام کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، مفتی صاحبؒ کی زندگی کا ہر پہلو روشن اور لائق عمل ہے، جب تک رہے قال اللہ اور قال الرسول کے نغمے گاتے رہے اور اسی کو لکھتے رہے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جس بات کو شریعت کے موافق جانا اور سمجھا، اسے لکھا اور بیان کیا، ایسی تحریروں کا پرزور اور سختی سے رد فرمایا جو مزاج شریعت کے خلاف رہیں۔ مفتی صاحبؒ کی

ذات، درس وتدریس اور تقریر وتحریر سے برسوں سے متاثر رہا، ان کی عظمت سے قلب معمور رہا؛ لیکن سب سے زیادہ جس بات نے مفتی صاحبؒ کی ذات کا گرویدہ بنایا، وہ ان تمام اداروں کو اپنی تنخواہ کا واپس کردینا ہے جہاں جہاں آپ نے تدریسی خدمات انجام دی، ایسے وقت میں جب کہ اچھی اور بڑی تنخواہ یاب اپنی تنخواہوں کو بڑھانے یا وصول کرنے کے لئے سڑکوں کو جام کررہے ہوں، ہڑتال کر رہے ہوں، پھر ایک بوریا نشین کا یہ عمل نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، مفتی صاحبؒ اب ہمارے درمیان نہیں رہے؛ مگر اپنی دینی خدمات سے وقوع قیامت تک یاد رکھے جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنی شایان شان لطف وکرم کا معاملہ فرمائے، دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

<u>محمد فہیم قاسمی گورکھ پوری</u>

<u>معاون مدیر:۔ ماہنامہ المناظر</u>

**صفحہ/۳۶ کا بقیہ:** عرفہ کے دن روزہ رکھنے کی فضیلت کے بارے میں حدیث شریف میں ہے " **صوم عرفة يكفر السنة الماضية والسنة المقبلة**، عرفہ کے دن کا روزہ رکھنا ایک سال پچھلے اور ایک سال اگلے گناہوں کو معاف کرادیتا ہے" (صحیح ابن خزیمہ) اور دوسری حدیث شریف میں ہے" **صيام يوم عرفة انى أحتسب على الله أن يكفر السنة التى قبله والسنة التى بعده**، یوم عرفہ کا روزہ رکھنے میں مجھے اللہ سے امید ہے کہ یہ ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہوں کا کفارہ ہوگا" (صحیح مسلم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عرفہ کے دن روزہ رکھنے کی ترغیب دی ہے بلکہ خود آپ نے بھی روزہ رکھا ہے، اختلاف مطالع کے سبب مختلف ملکوں میں الگ الگ دنوں میں یوم عرفہ ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں چنانچہ اس سال مملکت سعودیہ وغیرہ میں یوم عرفہ جمعرات کو ہوگا اور برصغیر ہندوپاک میں یوم عرفہ جمعہ کو ہوگا، برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کے لئے یہ تو بڑی سعادت مندی اور خوش نصیبی کی بات ہے کہ جمعہ کا دن بھی بابرکت اور عرفہ کا دن بھی بابرکت، نور علی نور ہوگیا۔

لہذا ہمیں چاہیے کہ ماہ ذی الحجہ کے عشرہ اول میں زیادہ سے زیادہ عبادت وطاعت میں وقت گزاریں اور روزآنہ کے معمولات مثلا ذکر وتلاوت، نوافل واستغفار اور دعا وغیرہ میں اضافہ کردیں، مولائے کریم ہم سب کو اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

خاص کالم: بیاد۔ رفیقۂ حیات مرحومہ محمد فہیم قاسمی تیسری اور آخری قسط

نقوش رحمت

# سیرت نبوی ﷺ کا عقلی تصور

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

رسول اکرم ﷺ کو اپنا محبوب شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر جانا پڑا وہاں پہنچ کر تین قسم کے مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا۔

(۱) یہود (۲) قریش (۳) مشترکہ فتنہ وفساد، ظلم وبے انصافی

بدامنی اور بدی کو مٹانے کے لئے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں ایک بار ایسی شرطوں پر بھی معاہدہ صلح کرلیا جو کھلے طور پر کمزوری کے مترادف تھیں؛ مگر آپ کے ہم وطن ان شرطوں پر بھی قائم نہ رہے اور صلح کے برخلاف رسول اکرم ﷺ کی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو قتل کر دیا گیا، خدا کے پیغمبر کو ان کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا، دس ہزار کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی ہوتی ہے، ابوسفیان نے صلح کرنی چاہی، آپ نے فرمایا: ''اگر ایک ایک مسلمان کو قتل کر دیتے پھر بھی شاید انتقام نہ لیتا؛ لیکن محمد ﷺ نے جن کو پناہ دی ان کو قتل کر دیا اسے برداشت نہیں کر سکتے۔''

حضرت سعد بن عبادہ انصار کی فوج کے علمبردار تھے۔ ابوسفیان کو دیکھ کر کہا کہ ''آج گھمسان کا دن ہے، حق وباطل کا فیصلہ ہوگا، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔ ابوسفیان نے رسول اکرم ﷺ کو توجہ دلائی تو جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا اور کہا جاؤ ابن عبادہ جاؤ! کہو آج جنگ کا دن نہیں ہے، آج رحمت عام کا دن ہے، آج کعبہ میں جنگ نہ ہوگی، آج کعبہ کو غلاف چڑھایا جائے گا، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔

رسول اکرم ﷺ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے، قلب مبارک اپنے خدا کے فضل واحسان کے بارے سے جھک گیا یہاں تک کہ سر اقدس اونٹ کے کجاوے سے جالگا، اہل مکہ گرفتار ہوکر سامنے پیش ہوتے ہیں، پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، جواب دیا کہ ہم بہادر ہیں! آپ کے ساتھی اگر ہماری گرفت میں آتے تو ہم سب کو قتل کر ڈالتے اور یہی آپ کو بھی حق ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں قتل کروں؟ خدا نے تو اتنی بھی اجازت نہیں دی کہ تمہیں ملامت کروں۔ ''آج تم

پر کوئی الزام نہیں ہے جاؤ تم ہر جرم وخطا سے بری ہو آج تم پر کوئی گرفت نہیں!''، مشکیں کھول دی گئیں اور سب آزاد کر دیئے گئے۔ یہ تھی رحمت عالم کی شفقت لا انتہا!

مورخ کہتا ہے کہ تین دن کے بعد اہل مکہ داخل ہوئے اور کہا کہ ہاتھ بڑھائیے تا کہ ہم اسلام لے آئیں، ارشاد ہوا کہ تین دن کے بعد کیوں آئے جواب دیا کہ مشکیں کھولنے کے فوراً بعد ہی اسلام لے آتے تو دنیا کہتی مرعوب ہوکر ایسا کیا اور ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ دنیا کے دکھانے کے لیے تو درگزر نہیں کیا گیا ہے۔ مبادا دھوکا ہی دیا گیا ہو، بعد میں پکڑ کر قتل کر دیا جائیں؛ لیکن آج ہم مطمئن ہوکر آئے ہیں اور خوشی کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤد نے بادشاہی کی اور حضرت موسیٰؑ نے فرعونی طاقت کے سامنے استقلال اور مردانگی کا مظاہرہ کیا اور حضرت عیسیٰؑ نے کہا (کہ ایک گال پر اگر کوئی تمہارے طمانچہ مارے تو دوسرا بھی پیش کر دو) رسول اکرمؐ نے دونوں چیزیں پیش کیں کہ بدلہ برابر کا لو۔؛ اگر معاف کر دو تو اللہ کے نزدیک سب سے محبوب کام ہے؛ لیکن زیادتی کسی حالت میں نہ کی جائے۔

آپ نے فرمایا کہ رہبانیت اور جوگی بننے کی اسلام میں ضرورت نہیں ہے، پہاڑ کی کھوہ میں عبادت کرنے والے سے وہ بہتر ہے جو بچوں میں رہ کر دنیاداری کے ساتھ خدا کو نہ بھولے، انسان کی تخلیق فطرت الٰہی پر ہوتی ہے، اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتا، اسلام نے جماعتی زندگی بخشی ہے، جماعت کے ساتھ نماز، ایک ہی مہینہ میں روزوں کی اجتماعی طور پر تکمیل، ایک ہی مہینہ میں فریضہ زکوۃ کی ادائیگی اور اسے اجتماعی طور پر بیت المال میں جمع کرنا، ایک ہی وقت میں اجتماعی طور پر حج کی ادائیگی۔ یہ سب اسلام کی بخشی ہوئی اجتماعی زندگی کے مظاہرے ہیں۔ میدان عرفات میں دنیا کے گوشے گوشے کے ہزاروں زبانیں بولنے والے آتے ہیں؛ لیکن وہاں ایک ہی زبان میں نماز پڑھتے ہیں، جس سے عالمگیر اجتماعیت کا مظاہرہ ہوتا ہے؛ اگر ہم جماعتی زندگی بنالیں تو عزت ورنہ رسوائی، اللہ کی رسی ایک ساتھ مل کر پکڑنے سے یہی مراد ہے کہ جماعتی زندگی بناؤ!

کاش ہم سب رسول پاک ﷺ کی سیرۃ سے سبق لیں اور خدائے پاک ہم کو اور آپ کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔

سیرت سرکار دو عالم ﷺ پر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے یہ تقریر ۲۹ر نومبر ۱۹۵۹ء کو نانپارہ ضلع بہرائچ میں ارشاد فرمائی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے حالات میں وہ اسوہ رسول کریمؐ کے مختلف پہلوؤں کو کس طرح پیش فرمایا کرتے تھے۔

# ذبح عظیم

مولانا سید سلیمان ندویؒ

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا خدا کی طرف سے خواب میں حکم ہوا تھا، یہود کہتے ہیں کہ وہ اسحاقؑ تھے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک حضرت اسمٰعیلؑ تھے اور اسی لئے ذبیح اللہ مسلمانوں میں حضرت اسماعیلؑ کا لقب مشہور ہے، اس کے لغوی معنی ہیں خدا کا ذبح کیا ہوا یا خدا کی راہ میں ذبح کیا ہوا، اس لقب کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

**یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ما ذا تری.** حضرت ابراہیمؑ نے کہا میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کررہا ہوں، تیری کیا رائے ہے۔

حضرت اسماعیلؑ نے جواب میں کہا:

**یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین.** (والصفٰت ۳/) اے میرے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو مجھے تو ثابت قدم رہنے والوں میں پائے گا۔

مقدس باپ نے اپنے بیٹے کے اس صبر وثبات کو دیکھا تو ان کو لے کر قربان گاہ کو روانہ ہو گئے، جو ان کی جائے قیام سے کئی دن کی مسافت پر تھی، وہاں پہنچ کر بیٹے کو لے کر اور آگے بڑھے اور بیٹے کو پیشانی کے بل گرا کر چھری ان کی گردن پر رکھ دی، آواز آئی، اے ابراہیم!

**قد صدقت الرءیا انا کذلک نجزی المحسنین.** (صافات ۴/) تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزائے خیر دیتے ہیں۔

طغیان نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل     سر زیر تیغ رفت وشہیدش نمی کنند

ابھی یہ منظر آنکھوں سے دور نہیں ہونے پایا تھا کہ ندا آئی:

**و فدینٰہ بذبح عظیم.** (صافات) اور ہم نے اس کو (اسماعیلؑ کو) ایک بڑی قربانی دے کر چھڑایا۔

اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ میں نے ایک دوسری بڑی قربانی کا فدیہ دے کر اسمعیلؑ کو ان کی اس قربانی سے نجات بخشی، اب سوال یہ ہے کہ وہ بڑی قربانی کیا تھی، جس کو

حضرت اسمعیلؑ کی اس قربانی اور فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا، مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں کہ جنت کا ایک مینڈھا لاکر حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کر دیا گیا، کہ وہ حضرت اسمعیلؑ کی جگہ قربان کیا جائے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا اور اس مینڈھے کو حضرت اسمعیلؑ کی جگہ قربان کیا؛ مگر یہ روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ نہیں اور ان سب کا ماخذ توراۃ ہے۔

''تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں، اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا، جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں، تب ابراہام نے جاکر اس مینڈھے کو لیا اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلہ میں سوختنی قربانی کے لئے چڑھایا''۔ (پیدائش ۲۲۔۱۳)

لیکن قرآن پاک میں اس مینڈھے کا ذکر نہیں؛ بلکہ اس کے بجائے ایک بڑی قربانی کہا گیا ہے؛ اگر یہ بڑی قربانی مینڈھے یا بکرے ہی کی صورت میں ہوتی تو قرآن اس کو ایک بڑی قربانی کیوں کہتا۔ ہمارے مفسرین نے اس یہ جوابات دیئے ہیں:

(۱) چونکہ یہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا اس لئے اس کو بڑی قربانی کا لقب ملا۔

(۲) یہ وہی مینڈھا تھا جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا اور جس کو خدا نے قبول فرمایا تھا، تو چونکہ خدا اس کو قبول کرچکا تھا اس لئے اس کو بڑی قربانی فرمایا۔

(۳) ان روایات میں سب سے بہتر جواب حسن بصریؒ کا ہے، فرمایا کہ اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں، جو حضرت ابراہیم کے سامنے قربانی کے لئے پیش ہوا؛ بلکہ وہ مطلق قربانی ہے جو اس کے بدلہ میں پوری ملت کے لئے قیامت تک یادگار سنت قرار پائی۔

جسمانی یادگار کی حیثیت سے اس میں شک نہیں کہ ابراہیمی ملت میں عید قرباں یا عید اضحیٰ کا سالانہ جشن اور اس میں غریبوں اور مسکینوں کے کھلانے اور دوستوں کی ضیافت اور خوشی کے اظہار کے لئے کسی جانور کی قربانی اسی واقعہ کی یادگار ہے، اسلام میں دو ہی تہوار ہیں، عید اور بقرعید، بقرعید ملت ابراہیمی کا جشن ہے، یعنی اس واقعہ کی یادگار ہے، جس کی بنا پر ملت ابراہیمی کی تاسیس اور مکہ میں خانۂ الٰہی کی تعمیر ہوئی اور وہ تعمیر ملت ابراہیم کا قبلہ قرار پائی، اور عید ملت محمدی کا جشن ہے یعنی نزول قرآن کی یادگار، جس سے پردہ عالم میں ملت محمدی کا ظہور ہوا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا، شریعت میں خواب کی دو قسمیں ہیں، ایک کا نام رویائے تمثیلی اور دوسرے کا نام رویائے

حقیقی ہے، رویائے حقیقی میں اصل حقیقت بے پردہ نظر آتی ہے اور وہی مقصود ہوتی ہے، جیسے کسی نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص مرگیا ہے اور وہ واقعی مرگیا تھا، یہ رویائے حقیقی ہے، رویائے تمثیلی یہ ہے کہ مقصود اس واقعہ سے ملتی جلتی کوئی مشابہ چیز ہو، جیسے حضرت یوسف نے قحط کو، سوکھی بالوں اور دبلی پتلی گایوں کی صورت میں دیکھا، امام خطابی معالم السنن میں کہتے ہیں۔

**بعض الرویاء مثل یضرب لیتاول علی الوجه الذی یجب ان یصرف الیه معنی التعبیر فی مثله و بعض الرویا لا یحتاج الی ذالک بل یاتی کالمشاهدة** (فتح الباری ر ج ۱۳/ ص ۴۰۲/ مصر) بعض خواب تمثیل ہوتے ہیں، جس کو اس مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا ہے، کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے، جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر پھیری جاتی ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے؛ بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

اس بناء پر ہم کو غور کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنے بیٹے کو قربان کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تو یہ خواب تمثیلی تھا یا حقیقی تھا، اس گرہ کے کھلنے سے **وفدیناه بذبح عظیم** کے معنی بھی کھل جائیں گے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب دکھایا تھا، وہ تمثیلی تھا، یعنی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کررہے ہیں کے یہ معنی تھے، کہ وہ اس کو ہمیشہ کے لئے خدا کی راہ میں خانہ کعبہ کی خدمت گذاری اور دین حنیف کی تبلیغ کے لئے خدا کی راہ میں قربانی کردیں، حضرت ابراہیمؑ نے فداکاری کے سچے جوش میں اس خواب کو حقیقی سمجھا اور چلے اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں واقعی جسمانی طور سے قربانی کرنے، مکہ کے پاس پہنچ کر بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھا کر چاہا ہی تھا کہ اس کے گلے پر چھری پھیردیں، کہ بارگاہ قدس سے ندا آئی، **قد صدقت الرؤیا**، اے ابراہیمؑ تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا اور اب خداوند حق نے حضرت ابراہیمؑ کو وحی سے مطلع فرمایا کہ یہ خواب حقیقی نہیں؛ بلکہ تمثیلی تھا اور حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی نہیں بلکہ روحانی قربانی مقصود ہے، اور یہ جانور کی جسمانی قربانی اس روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اب غور کیجئے تو معلوم ہوگا، کہ وہ ''ذبح عظیم''، جس کو دے کر حضرت اسمعیلؑ جسمانی قربانی سے بچ جاتے ہیں، وہ ان کی روحانی قربانی ہے۔

روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلہ میں یقیناً ذبح عظیم ہے، جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے؛ مگر روحانی قربانی تو کسی امر حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے،

جس میں مر کر نہیں؛ بلکہ جی کر حق کی راہ میں ہر تکلیف اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کے لئے آمادہ رہنا ہے۔

حضرت اسمعیلؑ نے اس کی خاطر ملک شام کے سبزہ زار کو چھوڑا وہاں کے عیش و آرام کو خیر آباد کہا، عزیز و اقارب کو ترک کیا، اور ایک لق و دق صحرا میں تن تنہا رہنا گوارا کیا، وہاں خدا کے نام کا ایک گھر بنایا اور اس کو آنے جانے والے مسافروں اور سوداگری کے قافلوں کے لئے مرکزی گذرگاہ ٹھہرایا اور اس طرح دین حق کی تبلیغ اور خانہ خدا کی پاسبانی کے لئے نہ صرف اپنی زندگی تک؛ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور تک جو ربنا **وابعث فیھم** کی ابراہیمی دعا کی قبولیت کا زمانہ تھا، اپنی پوری نسل کو ایسے صحرا سے بے آب و دانہ میں گذار دینے کا حکم دیا، یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جو حضرت اسمعیلؑ کی جسمانی قربانی کی تمثیل میں حضرت ابراہیمؑ کو دکھائی گئی اور آج کے دن تک یہ روحانی قربانی ملت ابراہیمی کی حقیقت اور نسل اسماعیلی کی شریعت ہے، اور جانور کی جسمانی قربانی اس حقیقت کا مجاز ہے اور اسلام میں جہاد اس مجاز کی حقیقت ہے۔

اس تفصیل سے معلو ہوگا کہ وہ ''ذبح عظیم'' کا فدیہ جس کے بدلہ میں حضرت اسمعیلؑ کی جسمانی قربانی معاف کی گئی، ان کی وہ روحانی قربانی ہے جو نسلاً بعد نسل ان پر فرض ہوئی اور اس کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوئی، اور اسی لئے یہ ہر سال کے جشن قربانی میں حضرت اسمعیلؑ کے جسمانی اور روحانی فرزندوں پر واجب ہے۔

جہاد اور شہادت جن کی فضیلتوں سے اسلام کا سارا دفتر لبریز ہے، وہ اسی ''ذبح عظیم'' کی تفسیر ہیں، جو مسلمان اس ذبح عظیم کا منظر پیش کرتا ہے بارگاہ قدس سے وہ بقائے دوام، حیات جاوید اور **بل ھم احیاء** کے سرخ خلعت سے سرفراز ہوتا ہے، جنت کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں، اور خداوند تعالی اپنے پاس کی روزی سے اس کو سیر فرماتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

☆----☆----☆

# فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

**دوآبہ دجلہ وفرات قدیم کلدانی عدن:۔** انسان جن بھٹوں میں رہتا ہے، وہ بہت بلند ہورہے تھے؛ لیکن خود انسان پست ہورہا تھا، دوآبہ دجلہ وفرات کے ایک قدیم تاریخی شہر میں یہ حادثہ گزر رہا تھا، امریکہ اور یورپ والوں کی طرح ان کی عمارتیں اونچی ہورہی تھیں، ایک منزل پر دوسری منزل کا اضافہ ہورہا تھا؛ لیکن انسانیت ایک زینہ سے لڑھک کر دوسرے زینہ پر اور دوسرے سے تیسرے زینہ پر گررہی تھی، حتی کہ آج جس طرح عموماً اونچے ایوانوں میں صرف حیوان بسیرا لیتے ہیں، یعنی جو اپنی زندگی کا مقصد کھانے، پینے، مرجانے کے سوا اور کچھ نہیں رکھتے، اسی طرح۔۔۔۔کلدانیہ جو اس دوآبہ کا مرکزی شہر تھا، اس کے باشندے حیوان ہی نہیں؛ بلکہ حیوانوں کی بندگی اور غلامی کا طوق گلے میں ڈالے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔

اللہ اللہ مسجود ملائکہ گائے، بیل، بلی، اور بندر کا ساجد بنا ہوا تھا اور حیوانات تو پھر بھی ذی شعور ہیں، ان کی پرستش تو انسانی پستی کا معتدل درجہ ہے، دردناک سماں اس وقت کا تھا ''زمین کا خلیفہ'' نفخت فیه من روحی ، کا پیکر لطیف، امانات الٰہیہ کا تنہا علمبردار، نباتات؛ بلکہ جمادات جیسی بے شعور ہستیوں کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا ہوا تھا، عناصر مادی، بے جان ستارے، بے حس آفتاب و ماہتاب کے آگے ماتھا ٹیکے پڑا ہوا تھا، عذاب الٰہی کا یہ دہشت انگیز نظارہ تھا کہ یکا یک ان ہی میں سے ایک خوبصورت جوان نے نعرہ مارا

**انی وجهت وجهی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین.** میں نے اپنا رخ اس قوت کی طرف پھیر دیا، جس نے آسمانوں اور زمین کو (نیستی سے) پھاڑ نکالا، میں اسی کی طرف جھکتا ہوں، میرے نزدیک اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

دعوی تھا اور کتنا بلند دعوی تھا، اس کے گھرانے کے لوگ مخلوق ہی کے نہیں؛ بلکہ مخلوق کی مخلوق اور انسانی مصنوعات کے گورکھ دھندوں میں الجھے ہوئے تھے، وہ فانی ہاتھوں کو نہیں؛ بلکہ فانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اپنے کو ربط دے رہے تھے؛ لیکن ان میں سے کیسا بلند ہمت نوجوان

جو جمادات ونباتات کی دلچسپیوں سے علیحدہ ہوکر، آفتاب وسیارات کی قہر بانیوں یا مہربانیوں کو ٹھکرا کر، مادی کروں کو چیرتا ہوا، مخلوقات کے دائرے کو پھاڑتا ہوا، حتیٰ کہ ملائکہ مقربین سے آنکھیں بچاتا ہوا، خدا جانے کس غیبی کشش کی بدولت یکا یک وہاں پہونچ گیا، جہاں غنا تھا، فقر کوراہ نہیں ملتی تھی، جہاں صرف رب رہتا ہے، مربوبات کی وہاں گنجائش نہیں، جو واقعی سب سے بڑا تھا، اس نے بھی پالیا کہ وہی سب سے بڑا ہے، اللہ اکبر جرأت اور کیسی جرأت۔

خلیلی امتحان:۔ دعوئے امتحان سے ثابت ہوتا ہے، علم عمل سے پختہ ہوتا ہے، امتحان لیا گیا، عمل کے لئے حکم ہوا، جنگلوں کے گپھوں میں نہیں، پہاڑ کے غاروں میں نہیں؛ بلکہ اسی سکھ اور دکھ کے آمیزہ میں، اسی حیرت کدہ دنیا میں حکم ہوا کہ سلطنت سے ٹکر کھاؤ، اس نے کھالی، حکم ہوا آگ میں پھاند جاؤ، پھاند گیا، گھر چھوڑ جاؤ، چھوڑ دیا، باپ سے قطع تعلق کرلو، اس نے کرلیا، قحط وگرانی کی مصیبت جھیلو، جھیل لی، دوسروں کے دروازوں پر جاؤ، روانہ ہوگیا، جو سب سے بڑی قوت سے وابستہ ہوگیا تھا، امتحان کے میدانوں میں اس سے یہ بھی کہا گیا، اپنی آبرو سے ہاتھ اٹھا، اسکی بیوی بھی چھین لی گئی، وہ دم بخود ہوکر راضی برضا ہوگیا۔

یہ سب کچھ ہوا اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا، سورج اور چاند والے، گائے اور بیل والے، پھلتے تھے، پھولتے تھے اور اسکے سامنے یہ سب کچھ ہورہا تھا؛ لیکن مخلوق والا نہیں؛ بلکہ خالق والا بے پھل کے تھا، اس کے کوئی اولاد نہ تھی، امتحان اور کڑا امتحان، دس نہیں بیس نہیں، اکٹھے ۵۸؍سال کا لمبا امتحان، سب کی آنکھوں کیلئے روشنی تھی؛ لیکن جس کا دل روشن تھا اس کی آنکھ اس سے محروم تھی؛ مگر بڑھاپے کے ان سخت دنوں میں جو ہم پر سخت ہیں؛ لیکن اس پر بہت آسان تھے، وہی جوانی کا نعرہ اسکی زبان پر جاری تھا، ہر راہ اور وادی میں وہ ان تمام باتوں کے بعد بھی یہی چلاتا پھرتا تھا:

''ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین لا شریک له وبذلک امرت وانا اول المسلمین'' میری پکار (میری پوجا) میری قربانیاں (اورنیتیں) بلکہ میری زندگی، میری موت (کسی مخلوق کیلئے نہیں بلکہ) اللہ کے لئے ہے، جو سارے جگت کا پالنہار ہے، اسکا کوئی ساجھی نہیں۔

مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اپنا سب کچھ خدا کے سپرد کرتا ہوں اور اسکے آگے جھک جاتا ہوں۔

اس نے سب کچھ واپس کر دینے کا اعلان کیا تھا، تو لینے والے نے بھی اس سے جَو جَو کا حساب کر کے لیا، وہ قدرتی طور پر امین تھا، خیانت کی تاریکی اسکی روشن فطرت میں رہ نہیں سکتی تھی۔

جس وقت وہ آگ میں کودا تھا یہ سچ ہے کہ "**ان تؤدو الامانات الی اھلھا**" (جسکی امانت ہو اس کو ادا کردو) کو پوری تعمیل کر چکا تھا؛ لیکن جتنا اپنے کو دینا آسان ہے، اپنی تمناؤں کا دینا اتنا آسان نہیں، خودکشی اتنی مشکل تو نہیں جتنا خودکشی کے اسباب و وجوہ کا برداشت کرنا، بال بچوں کی پرورش کیلئے سپاہی اپنی گردن کٹاتا ہے؛ لیکن بچوں کی گردنوں کا کٹوانا اس کے بس میں نہیں۔

ابراہیم (خلیل علیہ الصلوۃ والتسلیم) سے کچھ مانگا گیا، تو انہوں نے سب کچھ دیدیا، اپنے کو دیا، اپنے دھن اور وطن کو دیا، حتی کہ آخری شئ جس کیلئے جان و مال ہے، یعنی آبرو و ناموس، وہ بھی دیدی، اب انکے پاس کیا تھا۔

ہاں ایک مطالبہ اور سخت مطالبہ، نے جگر دیدیا تھا؛ لیکن لخت جگر دینے کا موقع ان کو کہاں ملا، اپنی آنکھیں انہوں نے آگ میں جھونک دی تھیں؛ لیکن جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس سے وہ کب دست بردار ہوئے تھے، بابر تو خود تو مرسکتا ہے؛ لیکن ہمایوں کا گلا کس طرح گھونٹے، بالآخر وہ وقت بھی آ گیا، ۵۸ سال کے بوڑھے کے گھر میں جو مصر کی شہزادی تھی، اس کے کان میں فرشتے نے آ کر کہا:

"تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی، اسکا نام اسماعیل رکھنا" (پیدائش باب ۱۶ درس ۱۰) اور انبیاء کی ولادت کی یونہی بشارت دی جاتی ہے، قرآن نے بھی "**وبشرناہ بغلام حلیم**" سے اس مژدہ کی تصدیق کی ہے، یہ تو صرف موجودہ مسلمانوں کی ذہنیت ہے کہ اپنے پیغمبر بلکہ دنیا کے پیغمبرؐ کی ولادت کے واقعات کو سن کر "مولود شہیدی کی روایت" کہہ کر، اپنے کو روشن خیالوں کی جماعت میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔

خیر یہ جملہ تو معترضہ تھا، مقصد یہ ہے کہ بچہ کی بشارت دی گئی اور اس زور شور کے ساتھ دی گئی کہ وہی فرشتہ مصر کی شہزادی سے پیامی بن کر بولا:

"میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے"۔ (توریت باب ۱۶ درس ۱۰)

الغرض بشارت ہوئی کہ لڑکی نہیں لڑکا ہوگا اور بڑی برکت والا ہوگا، دوسری جگہ اسی توریت میں اس برکت کی تفسیر ان لفظوں میں کی گئی ہے:

"قومیں تجھ سے پیدا ہوں گی اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے"۔ (پیدائش باب ۱۷، ۱تا۸)

اور فقط یہی نہیں، بینا نگاہوں کو تو اسی بشارت کی روشنی میں یہ بھی نظر آ گیا، اسی بچہ سے وہ بھی ظاہر ہوگا، جس کے لیے ہستی ظاہر ہوئی ہے، آخر توریت میں اس بشارت کا جو یہ قطعہ ہے، اس کا کیا مطلب ہے ''خداوند نے تیرا دکھ سن لیا، وہ عربی ہوگا اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف''۔ (پیدائش باب مذکور)''

ریف میں کس کو دبایا جا رہا ہے، کردستان میں کس کے لیے فتنے بپا کئے جاتے ہیں، عرب میں تفرقہ اندازی کی گھنگور گھٹائیں کس کے لیے اٹھائی جاتی ہیں، اٹلی سے پیغام جنگ کو بھیجا جا رہا ہے، سنگھٹن کا نشانہ کون ہیں، شدھی کی دھمکی کس کو دی جاتی ہے، جانوروں کی گردنیں بچانے کے لیے انسانوں کی کس جماعت کی گردنیں کاٹی جاتی ہیں، ''اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف'' کا کتنا سچا اور کتنا دلچسپ تماشا ہے، تیرہ سو برس کے طویل عرصہ میں کیا اس تماشے کی کبھی تعطیل ہوئی ہے، اور اس کو بھی جانے دو، ابراہیمؑ سے ابراہیمؑ کا مطالبہ نہیں تھا؛ بلکہ ان کی آرزو مانگی جاتی تھی، اور کون نہیں جانتا تھا کہ ''خندہ صبح تمنائے ابراہیم'' کون تھا صلی اللہ علیہ وسلم، **ربنا وابعث فیھم رسولا منھم** یہ کس کی دعا ہے۔

بہر حال بچہ پیدا ہوا اور اپنے وجود میں اس وجود اقدس کو لے کر دنیا میں آیا، جس کے لیے ساری دنیا آئی اور جو ابراہیمؑ ہی کا نہیں؛ بلکہ سچ یہ ہے کہ ابراہیمؑ کے خدا کا بھی مقصد محبوب تھا۔

بزرگ اور بوڑھے خلیل کا دل مطمئن تھا کہ یہ نونہال پھلے گا، پھولے گا، بشارت مل چکی تھی، خدا کے وعدے پہ خلیل نہ جیتے تو کون جیتا؛ لیکن صرف انسانیت کی نہیں؛ بلکہ ایمان کی آزمائش کا بھی کتنا سخت وقت تھا کہ ننانوے سال جس کے آستانہ پر پڑے رہے، پوری صدی جس کا مالا جپتے رہے اور جس کے قدموں پر دھن من سب کچھ لٹا چکے تھے، اسی کی طرف سے یکا یک آواز آتی ہے۔

''ابراہام! وہ بولا دیکھ میں حاضر ہوں، تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے بیٹے کو جسے تو پیار کرتا ہے، لے اور زمین مرو میں جا اور اسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے لئے چڑھا'' پیدائش باب ۲/۲۲

برکت کا وعدہ اور سوختنی قربانی کا حکم دل ہی نہیں؛ بلکہ ایمان ہلانے والی بات ہے۔

**و ظنوا ان قد کذبوا**. انبیاء کبھی اس گمان میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم جھٹلا دیے گئے۔

لیکن خدائے غیر مسؤل سے کون سوال کرے؟ احتجاج کر سکتے ہیں؛ لیکن اواہ حلیم ابراہیمؑ

سے اس کی کیا توقع ہوسکتی تھی، حکومت کی راہ میں عائد سوال و جواب بھی ہو، لیکن عشق ومحبت کی وادی میں تسلیم ورضا، خاموشی اور خوشی کے سوا کسی چیز کی گنجائش نہیں، اور واقعہ تو یہ ہے کہ ابراہیمؑ کو سوال کا حق بھی تو نہ تھا، جو اپنی زندگی، موت، بلکہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کردینے کا اعلان کر چکا تھا، اور جو اپنے کو مسلم (سب کچھ سپرد کردینے والا) کہتا تھا، اس کو دم مارنے کا کہاں موقع تھا، خلیل تو اپنا معاہدہ تو پورا کر، خدا اپنا وعدہ پورا کرے گا یا نہیں اس سے تجھ کو کیا بحث۔ آخر یہی ہوا بوڑھا باپ اٹھا اور اکلوتے بیٹے کے سامنے آیا، اس کے سامنے آیا جس کی پیشانی سے اس کی دعا چمک رہی تھی اور آخر بولا:

''بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟''

اکلوتے نے جواب دیا:

''ابا جان! جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے کر گزرئے، آپ مجھے ان شاء اللہ تھما ہوا پائیں گے''

۹۹/سال کا پیر بزرگ ابا جان، شباب میں قدم رکھنے والے سیزدہ سالہ اکلوتے کو اپنے ساتھ لیتا ہے، اس کے ہاتھ میں چھری ہے، کہا جاتا ہے کہ خلیل نے آنکھوں پر پٹی باندھی لی تھی، ہائے! مگر دل پر کیا رکھا تھا، اس کو کون سمجھ سکتا ہے، پہاڑ کے دامن میں آئے۔

<u>اسلام کا بنیادی پتھر:</u>۔ اس کے بعد کیا ہوا، قرآن نے اعلان کیا کہ ''**فلما اسلما**'' جب دونوں مسلمان ہوگئے، مسلمان کیا ہوئے، انسانیت کے افق سے ''اسلام'' ''تفویض کلی'' ''رد امانت'' کی ایک تابناک بجلی عالم کون میں کوندگئی، بوڑھے باپ نے اکلوتے کو پیشانی کے بل پٹک دیا، اور اس کی گردن پر چھری چلادی، جس کے ذبح ہوجانے سے کائنات ذبح ہوجاتی، پھر جیسا کہ ابراہیمؑ کے ساتھ پرانا دستور تھا کہ ابراہیم امانت سمجھ کر واپس کرتے تھے اور دینے والا انعام وجزا کہہ کر اس سے کہیں زیادہ کرکے پھر ابراہیمؑ ہی کی طرف پلٹا دیتا تھا، آگ گلزار بنائی گئی، عراق چھوڑا تو شام کی زمین ملی، بت تراشوں کے گھرانے کی بوڑھی بیوی کے ساتھ مصر کی جوان شہزادی عطا ہوئی، آج بھی وہی ہوا کہ آواز آئی:

**ونادیناه ان یا ابرهیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین.** ابراہیم! تم نے اپنے خواب کو پورا کر دیا میں احسان واخلاص والوں کو یوں ہی بدلہ دیا کرتا ہوں۔

وہ بدلہ کیا تھا؟ **انی جاعلک للناس اماما** (تمہیں ابراہیمؑ! بنی آدم کی امامت دی گئی) اسی کی پشت سے، ہاں اسی بچے کے مطلع سے دنیا کا سب سے بڑا سردار، قوموں کا امام، ممکنات کو مرکز

قیام، **وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا** کا پروانہ لےکراسی پہاڑ کے دامن سے جہاں ابراہیمؑ نے اپنا آخری امتحان پورا کیا تھا، طلوع ہوا، بڑھا چڑھا اور ساری دنیا پر اس کی روشنی پھیل گئی، پھیل رہی ہے اور پھیل جائے گی، خدا کا وعدہ پورا ہوگا۔ابراہیمؑ کے اس امتحان نے امامت کبریٰ کو پیدا کیا، امامت نے اس کو پیدا کیا، جو سود و زیاں کے مرکب کو قلیل کر کے صرف سودمند عناصر کی نہر جاری کرتا ہے، یہ نہر اس کو دی گئی۔

<u>لفظ کوثر کی تشریح:</u>۔ یہ امامت کبریٰ کیا ہے، لوگ کوثر (سب سے زیادہ بھلائی) کی تفسیر میں یوں کہتے ہیں کہ اس سے مراد فقط نہر، یا نبوت کبریٰ، یا قرآن، یا علم وحکمت، یا اولاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا امت محمدیہ یا علمائے امت یا اسلام ہے، یہ کیسا اختلاف ہے؟ کیا یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں نہیں؟ کیوں نہیں کہا جاتا؟ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **انا اعطینک الکوثر** میں کوثر سے مراد وہ ساری بھلائیاں ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئیں، بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد سعید بن جبیرؒ نے جب یہ تفسیر بیان کی تو کسی نے پوچھا کہ عام لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ''کوثر سے مراد ایک نہر ہے۔سعید نے جواب میں کہا:

**ان النهر فی الجنة من الخير الذی اعطاه الله اياه.** جنت کی نہر بھی تو اسی خیر کا ایک جز ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔

ابراہیم خلیل اللہ نے سب کچھ واپس کر دیا تھا، اس لئے اس کو اس کے نور نظر کو سب کچھ دے دیا گیا، ساری کائنات انسان کے لیے اور سارے انسان ابراہیمی ملت کے قدموں کے نیچے ڈال دیئے گئے، تو کیا ساری کائنات ان کو نہیں دی گئی، اس خیر وشر کے مرکب سے صرف ''عناصر خیریہ'' کو تحلیل کر کے ابراہیمؑ اور اس کی ''پیاری دعا'' کے حوالے کی گئی، جو کچھ بیٹے کو ملا وہ باپ ہی کو ملا، پس یہ کس قدر صحیح ہے کہ اے نبی! اے ابراہیمؑ کے فرزند سعید! میں نے تو تجھے کوثر عطا کر دی، یہی وہ راز ہے کہ جب دعائے خلیل فاران کی چوٹیوں سے چہرہ پرداز ہوئی، تو اس کی آواز، مقدس آواز یہی تھی، ''**اتبع ملة ابراهيم حنيفا**'' **ملة ابيكم ابراهيم** ''لوگ اس پر کیوں متحیر ہیں کہ خیر صفاتی اور نہر جسمانی میں کیا وحدت ہے؟ لیکن غور نہیں کرتے کہ جسمانی دودھ کی تعبیر علم سے جب کی گئی تو اس میں کیا وحدت تھی؟ مٹی کو گیہوں سے، گیہوں کو گوشت سے، آنکھ سے بھیجے سے، حتی کہ قوت بینائی سے شنوائی سے کیا نسبت ہے؟ وجود کے ان مختلف مراتب میں کیا وحدت ہے؟ فرق مراتب وجود سے

آنکھیں کیوں بند کی جاتی ہیں؟ اگر موت مینڈھے کی شکل میں ذبح ہوسکتی ہے؛ اگر قرآن کی سورتیں بادلوں اور پرندوں کے شکل میں نمایاں ہوسکتی ہیں؛ اگر اعمال وافعال سانپ، بچھو، ڈھال وسپر کے قالب میں ظاہر ہو سکتے ہیں، تو امامت کبریٰ یا اسلام؛ اگر ایسی نہر کی شکل میں ظاہر ہو، جس کے کنارے پر موتی کے قبے ہوں، تو اس میں جھنجھلانے کی کیا بات ہے۔تم تو بن دیکھے جھٹلاتے ہو؛ لیکن دیکھ کر ہماری روح کے دکھانے والے نے کہا: جب مجھے آسمانوں پر چڑھایا گیا تو میں ایک نہر پر پہنچا جس کے کناروں پر موتی کے قبے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ کوثر ہے۔(بخاری شریف)

اسماعیلؑ، ہاجرہ مصر کی شہزادی کے دکھ کی دعا کے جواب تھے، دکھ کی دعا کا جواب سکھ ہی ہو سکتا ہے، پس یہی تو ہاجرہ سے کہا گیا کہ خداوند نے تیرے دکھ کو سن لیا اور اس کو وہ بیٹا دیا گیا جس کی پشت سے خم خانہ کوثر کا پیمانہ بردار (صلی اللہ علیہ وسلم) اٹھا اور اس نے انسانی روح کی تشنگی کو بجھانے کے لئے حوض کوثر کا افتتاح کیا، جس کے کنارے بقول حضرت عائشہؓ آسمانی تاروں کے برابر گلاس اور پیمانے چنے ہوئے ہیں۔(بخاری شریف)

**قربانی سے اسلام کا تعلق:۔** پیے جاؤ، پلاتے جاؤ، ساقی کوثر کے فدائیو! دنیا کے آخری کناروں تک نسل آدم کے ہر فرد کو، یہاں بھی وہاں بھی دکھ کو نکالو، سکھ کی نسیم پرور انسانی بستیوں تک، ہندوچین میں، امریکہ اور یورپ میں، جزائر اور کوہستانوں میں، دنیا پیاسی ہے، پھر لوگ اس حوض کا پانی لے کر کیوں نہیں دوڑتے جس کے متعلق بخاری اور مسلم میں ہے ''جس نے اسے پی لیا وہ پھر پیاسا نہ ہوگا'' یہ کوثر اسی سپردگی، اسلام، اسی ''فلما اسلما و تلّه للجبین '' کے صلہ میں ملا، جو ۱۰؍ ذی الحجہ ۹۹ ابراہیمی میں مروہ کے دامن میں منی کے میدانوں میں صدق واخلاص کے سرچشمہ سے ابل کر، عملی شکل میں متشکل ہوا۔ باپ نے بیٹے کی قربانی کی تھی اور قربانی ہو بھی گئی؛ اگرچہ نہیں ہوئی۔ زید بن ارقم صحابی فرماتے ہیں کہ چند صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ قربانیاں کیا ہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے۔صحابہ نے پوچھا تو ہمارا اس میں کیا حصہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر روئیں کے بدلے ایک نیکی۔ (رواہ احمد فی مسندہ) ترمذی کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربانی سے زیادہ پسندیدہ عمل ۱۰؍ ذی الحجہ کو اور کوئی نہیں ہے، قیامت کے دن قربانی شدہ جانور لایا جائے گا، اپنے کھروں، بالوں،

سینگوں، کے ساتھ لایا جائے گا۔ فردوس دیلمی کی کتاب اگر چہ حدیث کی مستند کتابوں میں نہیں ہے تاہم اس کی روایت ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال کہ قربانی کے جانور پل صراط کی سواری ہوں گے، کس طرح ہوں گے، یا کیا ہوں گے، اس کو اس وقت کون جان سکتا ہے؟ لیکن قرآن میں ہے ''خداوند تعالیٰ قربانی کے گوشت اور خون کو نہیں لیتا ہے؛ بلکہ وہ تو تم سے صرف تقوی لیتا ہے، **لن ینال اللہ لحومھا ولا دمائھا ولکن ینالہ التقوی منکم.**

قربانی سے تقویٰ مقصود ہے:۔ ابراہیمؑ کی قربانی سے بھی اسمعیلؑ نہیں لئے گئے؛ بلکہ دونوں باپ بیٹے سے وہ دولت لی گئی، جس کی بدولت ابراہیمؑ کہتے پھرتے تھے کہ'' **ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین** '' دل پر غیر کی کتنی حکومت ہے، روح میں دوسرے کے فعل کی، دوسرے کی صفت کی، دوسرے کی قوت کی، دوسرے کے وجود کی کتنی اہمیت ہے؟ تم غیروں سے کتنے بچے کتنے متقی ہو؟ جب انسانیت نکھر کر بالکل خالص ہو جاتی ہے، تو پھر اس کو کون روک سکتا ہے، وہ کھینچتا ہے، رب قدوس کی طرف، وجود محض کی طرف، خیر مطلق کی طرف، تجلی گاہ ربانی کی طرف، جنت کی طرف، کھینچتا ہے کھنچ جاتا ہے جو خیر ہو گیا وہ طبعی طور پر سر چشمہ خیر سے جا ملتا ہے۔ پل صراط کے متعلق تو یہی آیا ہے کہ کوئی تار نگاہ کی طرح، کوئی برق اور بجلی کی طرح، کوئی تیز آندھی کی طرح، کوئی سناٹے بھرنے والے پرندے کی طرح، اور آخر میں یہ کہ کوئی گھوڑے کی چال سے، کوئی اونٹ کی چال سے، جنت کی طرف کھنچے گا، (ماخوذ از بخاری و مسلم) جو جتنا خالص تھا، جو جس قدر متقی تھا، اسی حساب سے اس کی کشش بھی ہے، لوہے کا جتنا جز کسی شئے میں ہوگا اسی حساب سے وہ مقناطیس کی طرف کھنچے گا، لیکن کیوں کھنچا؟

تقوی کی شدت وضعف کے یہ آثار ہیں، تقوی کا اکتساب علم سے کیا جاتا ہے، علم کی جانچ عمل سے ہوتی ہے، ابراہیم خلیلؑ نے جان و مال، آبرو، عزت، حتی کہ جس کے لئے سب کچھ ہوتا ہے یعنی لخت جگر، نور نظر کی قربانی کر کے ''اپنے تقویٰ'' کو پیش کیا، اور صرف اسمعیلؑ ہی کا معاملہ ہوتا تو غنیمت تھا، سچ تو یہ ہے کہ ابراہیمؑ کی قربانی بڑی قربانی تھی، اس نے خدا کی قربان گاہ پر اس کو لا کر بھینٹ چڑھا دیا، جس پر ساری دنیا قربان ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ ابراہیمؑ ہی کا کلیجہ تھا، ابراہیمؑ ہی کا تقویٰ، اسی کا تحمل تھا۔

بہر حال یہ وہ تقوی تھا، جس کو خدا نے ابراہیمؑ سے لیا یہ اس کی رحمت ہے اور ہمارا ضعف ہے کہ صرف چند سکوں کی قربانی سے جن سے قربانی کے جانور خریدے جاتے ہیں فقط اسی تقویٰ کو ہم

سے قبول کر لیتا ہے، پھر قربانی کا حاصل شدہ تقویٰ اگر پل صراط پر ہماری رفتار، ہماری کشش کو تیز کر دے اور ہم ان ہی قربانیوں کے بل بوتے پر خدا کے فضل کی طرف کھنچ جائیں تو لوگ اس پر استہزاء کیوں کرتے ہیں، ہاں! جس نے خراب وخستہ، بڈھی، مریل قربانی کے ذریعہ سے اپنا تقوی پیش کیا، کیا وہ خود نہیں دیکھتا کہ اس کے تقوی میں ضعف ہے اور اگر ضعف کی بدولت وہ بجائے سرچشمہ خیر کے لڑکھڑا کر شر کے اندھے کنویں میں گر گیا تو کیا قدرت کا یہی اٹل قانون بھی نہیں ہے۔

**حصول تقویٰ کا ذریعہ قربانی کیوں ہے؟:۔** جن احساسات کو ہمارے اندر قوت سامعہ پیدا کرتی ہے کیا قوت شامہ سے ہم ان کو حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ خوشبوں سے بھی مقصود دلی راحت، انشراح وانبساط کا اکتساب ہے اور جو سریلی آوازوں کی طرف کان لگاتا ہے وہ بھی اپنے دل کو خوش ہی کرنا چاہتا ہے، مقصود دونوں کا ایک ہی ہے، لیکن وہ احمق ہے، جو مسرت کی ان دونوں کیفیتوں میں فرق نہیں کرتا، نغمہ اور خوشبوں کی خصوصی تاثیرات سے قطع نظر کرنے والا کائنات کی گونا گونیوں اور بوقلمونیوں کے اسرار واغراض کو جھٹلاتا ہے، تمہارے باغ میں اگر انگور ہیں اور ان سے تمہارا ذائقہ لذت اندوز ہو سکتا ہے، تو سب کے درختوں کو کیوں کاٹتے ہو، انگور میں جو کچھ ہے اسے چوسو اور سیب جو کچھ دیتا ہے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرو، مجھ سے میرے دوست یہ کیوں کہتے ہیں کہ کیا قربانی کی جگہ صرف دام کا خیرات دینا مفید نہ ہوگا، خیرات سے بھی تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور قربانی سے بھی ''تقویٰ'' کا لینا خدا کا مقصود ہے؛ لیکن دونوں کو ایک کیوں کرتے ہو، گلاب سے بھی آنکھیں سیراب ہوتی ہیں؛ لیکن اس کی باصرہ نوازی وہی ہے جو نسرین ونسترن، سیوتی اور یاسمن کے سادہ رخساروں سے دلوں کو ملتی ہے، چمن میں وہ بھی ہے اور یہ بھی، اس کی غرض اور ہے اس کی غرض اور، اس بنگلہ کے مالک کو میں نہایت حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا جو اپنے پائیں باغ سے گلاب کے سوا اور پھولوں کے گملوں کو نکال نکال کر پھوڑ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ میری آنکھوں کی سیر کرنے کے لئے کیا گلاب کی پنکھڑیاں کافی نہیں ہیں؟

**کیا قربانی کرنے میں جیو ہتیا ہے:۔** لیبر لینڈ (مزدورستان یا کلی کھیڑا) کے باشندے کہتے ہیں اور صرف وہی کہتے ہیں، ان کی ایک محدود جماعت کہتی ہے، محدود جماعت کے چند طبقات کہتے ہیں اور ان طبقات میں سے بھی اکثر کرتے تو وہی ہیں جو اپنے ۳۲ دانتوں میں کچلی رکھنے والے

انسان کرتے ہیں؛ لیکن کہتے ہیں، خدا جانے کن مصلحتوں کی بنا پر کہتے ہیں کہ جانور کو کیوں ذبح کرتے ہو، جاندار ہستیوں کو کیوں مارتے ہو، کتنی اچھی بات کہتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ رحم جس کا تخم تمام عالم کی انسانی فطرت کی گہرائیوں میں بویا گیا تھا اور بجز اس مسئلہ کے ہر موقع پر ہر جگہ اس کی نمائش بھی ہوتی رہتی ہے، اس کے آثار ہویدا ہوتے ہیں یکا یک ساری دنیا سے سمٹ کر صرف ان ہی سینوں میں اتر آیا ہے، اسی ملک کے باشندوں میں اس کا مواد جمع ہو گیا ہے، جس کی قسمت میں محکومیت کے سوا تاریخ والو کے نزدیک اور کچھ لکھا ہوا نہیں ہے، مبارک ہے وہ ملک جو جانوروں پر رحم کھاتا ہے اور کسی کو اپنے ملک میں آنے سے نہیں روکتا، یا جذبہ رحم کی مغلوبیت سے نہیں روک سکتا، وہ دوسروں کو مار نہیں سکتا کہ وہ جاندار ہیں، حتی کہ خود بھی نہیں مر سکتا کہ اس کے پاس بھی جان ہے۔

<u>موت کا علاج:۔</u> موت! کتنا بھیانک لفظ موت! ہمارے ملک میں، ہمارے مزدور ملک نے اس کا تو احساس کیا اور سبھوں نے کیا، بڑی مشکل شئی، نہایت دشوار حقیقت، لیکن جس طرح اس کی دقتوں کو انہوں نے محسوس کیا تھا، کوشش کرتے کہ اس مشکل کے حل کی کیا راہ ہے؟ مارتا بھی اٹھ جاتا ہے، اور مارا جاتا بھی اٹھا دیا جاتا ہے، لیکن مرنے کو کون ٹالے، ہاں! اس نے ٹالا جس نے اس کی تلخی میں مادر وطن کے نام کو شریک کر لیا، واٹر کو کے میدان میں، اے تلخ و تیز موت تو ''مدر لینڈ'' کے منتر سے کتنی آسان ہوگئی، پورٹ ارتھر میں تیرا جام کتنا خوش گوار تھا، جب ''حب وطن'' کے چھینٹے تجھ میں شریک کر دیئے گئے، تم وطن کے لئے ہو'' ایک آواز موت کی تلخی کو دھو دیتی ہے، ''تم قوم کے لئے ہو'' کتنا پیارا نغمہ جس نے ہمیشہ موت کی سختی کو نرم کر دیا؛ لیکن اسی کے ساتھ ایک اور آواز دی جاتی ہے'' تم اس کے لئے ہو جس کے لئے سب کچھ ہے'' تو بتاؤ کہ روح کی بیتابی کا کیا حال ہو، جانوں کے اضطراب کی کیا کیفیت ہو؟ لوگ شاعری سمجھیں گے؛ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ بدر کے میدان میں اور خیبر کی وادی میں، قادسیہ اور یرموک کی گھاٹیوں میں اس نداء نے موت کو جتنا شیریں جتنا لذیذ کر دیا تھا کبھی نہیں کیا، انا للہ وانا الیہ راجعون. موت کیا تھی، ان میدانوں میں کیا تھی؟ ایک کھیل تھی، ایک تماشا تھا، جس کا سب کچھ ہے اور جس کی طرف سب جا رہے ہیں، اسی کیلئے اسی کی طرف جانے کے لئے، موت کے موٹر کی تلاش کس بے تابی کے ساتھ کی جاتی ہے!

<u>ہتیا کا حکم اسلام میں:۔</u> ''جیو ہتیا'' نہیں کرنا چاہتے، جانوں کو ایذاء نہیں پہنچانا چاہتے، اسلام کا بھی یہی حکم ہے، بلا وجہ کسی جاندار کے ستانے کو کون جائز رکھ سکتا ہے، جانوروں کو بلا وجہ

مارنے والے خاتم النبیین ﷺ کی زبان پر ملعون کئے گئے ہیں، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت کی ہے، جو کسی جاندار چیز کے ساتھ چاند ماری کھیلے'' اور فقط اس طرح جیو ہتیا کرنے والے ہی ملعون نہیں ہیں؛ بلکہ دنیا کے آخری اور سب سے بڑے پیغمبر ﷺ کی زبان مبارک پر وہ بھی ملعون کیا گیا ہے جو کسی جاندار کو یوں ہی دکھ پہنچائے، صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک گدھے کے پاس سے گذرے آپ نے دیکھا کہ اس کے چہرہ کو داغا گیا ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' خدا کی اس پر لعنت ہے جس نے اس کو داغا''۔

مسلم ہی میں ہے کہ آپ نے عموما جانوروں کو ان کے منہ اور چہرہ پر مارنے کی ممانعت فرما دی ہے، اور صرف مارنے پیٹنے پر کیا موقوف ہے، جانوروں کو کھانے پینے کی تکلیف پہنچانا اسلام میں بہت بڑا گناہ ہے، اسی طرح ان کو آرام پہنچانا بہت بڑا ثواب ہے، معراج کی حدیث میں ہے کس نے نہیں پڑھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عورت کو جہنم میں عذاب بھگتے دیکھا، اس نے ایک بلی پال رکھی تھی، جس کو نہ چھوڑتی تھی کہ خود چل پھر کر کچھ کھائے اور نہ خود کھلاتی تھی، اسی طرح آپ نے فرمایا کہ ایک شخص جنت میں فقط اس لئے گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو اپنے موزۃ سے پانی نکال کر پلایا، یہ دونوں روایتیں بخاری میں ہیں، صرف ان ہی دو روایتوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جانداروں کو دکھ اور سکھ پہنچانے میں اسلام کا نقطہ نگاہ کیا ہے۔

بلا شبہ مرنے میں بھی اذیت ہوتی ہے، خود مرے یا دوسرا مارے، نزع روح کی تکلیف دونوں میں مشترک ہے، پھر کون ہے کہ ''موت'' آہ! کہ ''تلخ موت'' کے پنجہ کو جاندار ہستیوں کے حلق سے ہٹالے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ''مارنا'' چھوڑ دو، لیکن کیا ممکن ہے؟ پانی کے ہر قطرہ میں ہزاروں کیڑے رہتے ہیں، ان کا مارنا کس طرح بند ہو؟ سانپ، بچھو، کھٹمل، جوں، کے مارنے کو کون روک سکتا ہے؟ تالابوں سے، باولیوں سے پانی نکالا جاتا ہے، تالاب کا پانی خشک ہو جاتا ہے اور انسان ہزاروں جانوروں کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کرتا ہے، کھیتوں کے سوراخ میں خدا جانے کتنے کیڑے، مکوڑے رہتے ہیں، ان کی گردن الگ ماری جاتی ہے، اور آہ! اگر اس امر کو چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اناج کے بغیر پھر انسان کا گلا گھٹتا ہے، آخر وہ بھی تو جاندار ہے، اس کو بھی جانے دو، جگدیش چندر بوس کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ درختوں کو بھی کاٹنے سے تکلیف ہوتی ہے اور اس مسئلہ کو یورپ اور امریکہ کی تجربہ گاہوں میں انہوں نے سائنس کے غیر مشکوک آلات سے مشاہدہ بھی کرادیا اور الغرض ''مارنے'' کے

روکنے پر ہم قادر بھی ہوجائیں تو مرنے کو کون روک سکتا ہے، موت کی تکلیف تو پھر بھی باقی رہ جاتی ہے، کسی نے نہیں کوئی نہیں، ان میں سے ایک بھی نہیں، جس نے اس مسئلہ کو سوچا، اس عقدہ کو سلجھایا۔

ذبح میں تسمیہ کی شرط:۔ عالم کے اس ''کرب'' کو بھی جس نے سنا، روحوں کی اس چیخ کی طرف جس نے توجہ کی، وہ بھی وہی تھا، جس نے عالم کی دوسری مشکلات کو آسان کیا، ارے ''حب وطن'' کے منتر سے موت کی کلفت لذت بن جاتی ہے، قوم کے نام سے جب ''مرگ کا پیالہ'' امرت بن جاتا ہے، تو پھر دنیا کو یہ پیغام کیوں نہیں سنایا گیا کہ وطن اور قوم جسکے لئے ہے، آسمان وزمین جس کے لئے ہے، ذرہ سے لےکر آفتاب تک جس کے لئے ہے اس ''مقدس نام'' سے اس مشکل کو حل اور ہلاہل کو ساغرمل بنایا جاسکتا ہے، اور یہی وہ راز ہے کہ اسلام نے اعلان کیا کہ کوئی چیز نہ ماری جائے، نہ کسی جانور کو ذبح کیا جائے، جب تک کہ اس پر اس ''مقدس اور بڑے نام'' کا ذکر نہ کرلیا جائے، قرآن نے اس حکم کی تشہیر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کنجشک یا اس سے بڑے جاندار کو مارے گا تو خدا کے یہاں جواب دہ ہوگا، جب تک اس کا ''حق'' نہ ادا کردے، صحابہ نے پوچھا کہ اس کا کیا حق ہے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا کا نام لے کر ذبح کرنا'' جیوہتیا کے وبال سے بچنے کی یہی راہ ہے، عرب کا گھوڑا اپنے آقا کو پہچانتا ہے، ہندوستان کا ہاتھی اپنے مالک کو جانتا ہے، یورپ کا کتا اپنے میڈم سے محبت کرتا ہے؛ اگر یہ سچ ہے اور قطعا سچ ہے تو پھر میرے اس بیان کی کیوں تکذیب کی جاتی ہے کہ دنیا کے جاندار اپنے جان آفریں کو پہچانتے ہیں، تم پر اپنے آقا کے لئے، اپنے وطن کے لئے، اپنی قوم کے لئے مرنا آسان ہے، ان پر اپنے خدا کے لئے اپنے پالنے والے کے لئے جس طرف ہر چیز پلٹ کر جانے والی ہے، اس کے لئے جو ساری موجودات کا سرچشمہ ہے، سب سے بڑا ہے، اسکے لئے ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کا کلمہ جانفزا سن لینے کے بعد مرنا آسان ہوجاتا ہے۔

پس جو پانی کے کیڑوں کو بغیر بسم اللہ کے پیتا ہے، جو کسی جانور کو بغیر بسم اللہ کے مارتا یا ذبح کرتا ہے اور جو کسی درخت کو اللہ کا نام لئے بغیر کاٹتا ہے بلاشبہ وہ ''جیوہتیا'' کا مرتکب ہے، پر جس نے جانوروں کی ''تلخ موت'' کو ''موت شیریں'' سے بدل دیا وہ ان کا دشمن نہیں؛ بلکہ محسن ہے، کیوں کہ وہ اگر ذبح نہ ہوتے تو کبھی نہ کبھی خود مرتے اور موت کی ساری اذیتوں کے ساتھ مرتے کتنا مبارک ہے وہ انسان جس نے جاندار ہستیوں کو ایک بڑی مصیبت سے نجات بخشی۔

حنانہ کا ستون خدا ہی کو نہیں خدا کے رسول کو بھی پہچانتا ہے، اشجار و احجار صرف خدا ہی کے حکم کو نہیں جانتے؛ بلکہ اس کے پیغمبر پر سلام بھیجتے ہیں، اس کی رسالت کی شہادت دیتے ہیں، کیا وہی اونٹ جو آنحضرت ﷺ کے قدموں پر سر ڈال کر روتا اور بلبلاتا تھا اور اپنے مالک کی شکایت کرتا تھا وہ کہ وہ مجھ سے کام زیادہ لیتا ہے؛ لیکن کھلاتا کم ہے، کیا یہ عقل کی بات ہے کہ وہ حضور کو تو پہچانتا تھا؛ لیکن حضور ﷺ جس ذات اعلی کے رسول اور عبد تھے اس کی کوئی معرفت اپنے پاس نہیں رکھتا تھا، اور یہی وہ راز ہے کہ ''صحیح ذبح'' ایسا ذبح جس کے متعلق آخرت میں پرسش نہ ہوگی اور جسکو کھایا جا سکتا ہے، اس کے متعلق تسمیہ کی شرط لگا دی گئی؛ بلکہ ہر فعل کی ابتدا میں بھی اس شرط کو عام کر دیا، تا کہ اس نام سے جہاں اور برکات حاصل ہوتے ہیں وہاں ایک نفع یہ بھی ہے کہ اگر کسی فعل یا عمل میں دانست یا نادانستہ کسی جاندار سے دامن الجھ جائے تو اس کی پاداش سے انسان بچ جائے، جین مت کے متقشف رات کو نہیں کھاتے، منہ پر ڈھانٹے باندھتے ہیں کہ کہیں غذا یا سانس کی راہ سے کوئی کیڑا منہ میں نہ چلا جائے، لیکن جس نے ''بسم اللہ'' کہہ کر ''میدان عمل'' میں قدم رکھا ہے یا جو بسم اللہ کہہ کر کھاتا ہے وہ ان تمام قیود سے آزاد ہے اور ان سے زیادہ بہتر طریقہ سے حیوانات کی موت اور اذیت کے مسئلہ کو اس نے آسان کر دیا علی الخصوص قربانی کے موقع پر جو جاندار اللہ کے نام سے اپنی مشکل کو حل کرتا ہے اس کی بلند قسمت کے کیا کہنے، جس جگہ پر اسمعیلؑ کو ہونا چاہئے اللہ اللہ آج اس مقام پر خدا کی رحمت کا تو اندازہ کرو کہ ایک جانور ہے۔

<u>انسانی خوراک بن جانے کے بعد حیوان ایک درجہ بلند ہو جاتا ہے:۔</u> مٹی گھاس میں جا کر گھاس بن جاتی ہے، گھاس بکری میں پہنچ کر بکری بن جاتی ہے، پھر کیا یہ کہنا غلط ہے کہ بکری انسان میں جا کر انسان ہو جاتی ہے، انسان جب ترقی کرتا ہے تو دنیا کی زندگی سے آگے بڑھ کر بہشت کی زندگی حاصل کرتا ہے، اسی طرح اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ جانور ذبح ہونے کے بعد انسان کی غذاء بن کر جنت میں پہنچ جاتا ہے، تو لوگ اس پر ہنستے کیوں ہیں؟ ہر ماتحت کے لئے اس کا بالائی درجہ جنت نہیں تو اور کیا ہے۔ لوگوں نے تعمیر کا نام تخریب رکھا ہے؛ لیکن نام سے حقیقت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

<u>مسئلہ گاؤ:۔</u> خالق سے چھوٹ کر جو لوگ مخلوقات کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سب جانوروں پر نہیں؛ بلکہ ہمیں صرف ان حیوانوں کے متعلق اعتراض ہے جو ہمارے ''معبود'' ہیں، اگرچہ تناسخ ماننے والوں کے منہ سے یہ بات کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی، حیوانی جون میں جو ''پاپی''

عذاب بھگت رہا ہو کیسی عجیب بات ہے کہ وہی پاپی ''معبود'' بھی ہو جاتا ہے؛ لیکن خیر اس سے ہمیں کیا، ہم تو صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ جب آپ کا مسلک ہی مخلوق پرستی ہے، تو پھر آج آپ کسی ایک یا دو جانور کو پوجتے ہیں اس لئے ہم اسے چھوڑ دیں، لیکن کل آپ کے معبود میں کسی اور کا اضافہ ہو گیا اور ہوتا ہی رہتا ہے، تو پھر ہم کہاں تک صبر کر سکتے ہیں، جو کسی جانور کو پوجتے ہیں کیا ان کے لئے مشکل ہے کہ آج وہ مثلاً لنگور یا گائے کو پوجتے ہیں کل وہ مرغی اور بکری کو بھی پوج ڈالیں، پرسوں گیہوں اور چاول کے آگے بھی ماتھا ٹیکنے لگیں، آخر اس حماقت کا ساتھ انسان کب تک دے سکتا ہے۔

<u>ایک جدید احتجاج کا اندیشہ:</u>۔ سنا ہے کہ مخلوق پرستوں کی کوئی جماعت ہے، جو انسانوں کے عضو مخصوص (لنگ اور بھگ) کو پوجتی ہے، اور اس کا ارادہ ہے کہ ختنہ کرانے والی قوموں سے جنگ کرے کہ کیوں اس کے معبود کی گردن کاٹتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ گائے کو تو معدودے چند لوگ قربانی میں دیتے ہیں؛ لیکن اس غریب دیوتا کی گردن تو ہر ایک مارتا ہے اگر یہ مسئلہ چھیرا تو پھر ختنوں کی خیر نظر نہیں آتی۔

غلامستان میں ایک نرا نزاعی مسئلہ قربانی کا ہو گیا ہے، میں اسکے سمجھنے سے بالکل عاری ہوں کہ ہندو مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ قربانی ترک کردو، گائے کو ذبح نہ کرو، سنا ہے کہ اسکے جواب میں مسلمان کہتے ہیں کہ تم سود چھوڑ دو، یہ عجیب مطالبہ ہے، نہ سائل کا پتہ ہے، نہ مجیب کا، ایسی دو قومیں جو محکوم ہیں جن کا اتفاقی امام یا امیر نہیں، کیا ایسے منتشر شیرازہ میں کسی سوال کا پیش کرنا اور اس کے عملی جواب کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ کلی کا کلی سے مطالبہ ہے، افراد سب آزاد ہیں، اور آخر ان کو کون پابند بنا سکتا ہے۔

بنارس کے ایک پنڈت جی کہتے ہیں کہ مسلمان ہمارے دشمن ہیں کہ وہ ''گئو ہتیا'' کرتے ہیں، لیکن جاپان اور چین ان کے سرپرست ہیں: کیوں کہ ان ممالک میں یہ نہیں ہوتا۔ ان ہی پنڈت جی سے کسی نے عجیب سوال کیا تھا کہ مائی گنگا بھی تو معبود ہے، اس کو پیکر پیشاب بنانا کیوں جائز ہے، پھر یہی برتاؤ اگر کسی اور دیوتا کے ساتھ ہو تو اس میں کیا حرج ہے، سنا ہے کہ استفتا گیا ہے، معلوم نہیں کہ کیا جواب آئے۔

بہر حال ہمیں اس سے کیا بحث، ہم کو تو صرف یہ معلوم ہے کہ ہمارے آقا کو امامت کبری ملی۔ جس کا نتیجہ کوثر ہے، اس کے شکریہ میں نماز پڑھنا اور قربانی کرنا چاہئے اور دشمن کا معاملہ خدا کے سپرد کرنا مناسب ہے، اس کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی نسلوں کو کاٹ دے گا۔

**انا اعطینک الکوثر فصل لربک وانحر ان شانئک ھو الابتر.** میں نے تمہیں کوثر عطا کیا، پھر اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر، تیرے دشمن ہی منقطع النسل ہیں۔

# قربانی کا اقتصادی پہلو

مولانا سید سلیمان ندویؒ

عیدالاضحیٰ جس کے معنی جشن قربانی کے ہیں، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے تاریخی واقعہ کی یادگار ہے، اس وقت کے جو سامی بادشاہ عراق، شام اور مصر پر حکمراں تھے، وہ اپنے نمرودی اور فرعونی کبر ونخوت میں مبتلا تھے، ہر جگہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے بادشاہوں کی پوجا ہو رہی تھی، ضرورت تھی کہ ان نمرودوں اور فرعونوں کی جابر وظالم سلطنتوں کے حدود سے آزاد کسی سرزمین میں اس پیام حق کے لئے جو حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ دنیا میں آیا تھا، کوئی مرکز قائم کیا جائے، جو ہر قسم کی دنیاوی سرسبزی وشادابی سے پاک ہو؛ تاکہ سلاطین کی حرص وآز کے ہاتھوں سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

انتخاب کی نظر عرب کی اس شور اور بنجر زمین پر پڑی، جس کا نام حجاز ہے، جو بحر احمر کے کنارے شام اور یمن کے دو زرخیز علاقوں کے بیچ میں آمد ورفت کا راستہ اور تجارت کے قافلوں کا گذرگاہ تھا، تاہم چونکہ وہ ہر قسم کی روئیدگی کی اور سیرابی سے مبرا تھا، اس لئے اس میں کوئی مستقل آبادی نہ تھی؛ لیکن سوداگروں کی آمد ورفت سے وہ تبلیغ کا اہم مرکز ہوسکتا تھا، اس لئے زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی قسمت میں ازل سے جو عزت مقدر ہو چکی تھی، حضرت ابراہیم کے عہد میں اس کے ظہور کا وقت آیا۔

حجاز دعوت حق کا مرکز قرار پایا اور خانہ کعبہ کی تعمیر اور تطہیر کا حکم آیا اور اسکی پاسبانی کے لئے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی سب سے پیاری اور اکلوتی اولاد حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا منظر خواب میں دکھایا گیا، اس جسمانی قربانی کے خواب کی تعبیر روحانی قربانی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے مروہ پہنچ کر اپنے خواب کی جسمانی تکمیل کرنی چاہی، اے ابراہیم! تم اپنے خواب کو پورا کر چکے، اور اب اس خواب کی تعبیر وہ ''ذبح عظیم'' یعنی عظیم الشان قربانی ہے، جو اپنی جان کو راہ حق میں دے کر اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں لٹا کر ادا کر سکتے ہو، اس رمز کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی ہے، جو ہر حاجی پر ہر سال فرض ہے، ہر مسلمان پر جس میں استطاعت ہو واجب ہے۔

اس خواب کی حقیقی تعبیر کی تکمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو شام کے مرغزار سے لاکر حجاز کے بے آب ودانہ اور شور زمین میں خانہ خدا کے پاس آباد کیا؛ تاکہ حق کا پیغام اور توحید کی

دعوت سلاطین زمانہ کی جابرانہ تعدی سے محفوظ رہ کر آخری پیغام الٰہی کے ظہور کے لئے تیار رہے۔

اس بے آب و دانہ بنجر اور شور زمین میں کسی انسانی آبادی کی بقا کسی مادی اقتصادی انتظام کے بغیر ناممکن تھی، اور ہے، اس کے لئے قدرت الٰہی نے دو انتظام کئے، حج اور قربانی، حج کو علاوہ اپنے روحانی فیوض و برکات کے اقوام عالم کی تجارتی نمائش گاہ یا عالمگیر تجارتی میلہ ٹھہرایا، اشہر حرم کے مامون زمانہ میں عرب کے سارے گوشوں سے تاجر اور سوداگر آتے ار مکہ کے میدان میں قیام کر کے سال بھر کی روزی پیدا کرتے۔

اسی نکتہ کو سامنے رکھ کر حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کے معنی سمجھئے:

**وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ.** (بقرہ ۱۲۶) اور جب ابراہیم نے کہا، اے میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور یہاں کے رہنے والوں کو کچھ پھلوں میں سے روزی کر۔

**رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ.** (ابرہیم/۳۷) اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد بن کھیتی کے میدان میں تیرے عزت والے گھر کے پاس اس لئے بسائی ہے کہ نماز کو قائم کریں، تو انسانوں کے کچھ دلوں کو ان کی طرف مائل کر، اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ شکر گزار ہوں۔

حج کی تجارتی گرم بازاری اور حاجیوں کی آمد و رفت سب اسی لئے ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس ویرانہ کی روحانی، جسمانی و مالی آبادی ہو، اسلام آیا تو لوگوں نے سمجھا کہ روحانی مقصد سے حج کے مالی مقاصد رد کر دیئے گئے؛ مگر خدا نے تصریح کی کہ ایسا نہیں ہے، فرمایا:

**لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ.** تمہارے لئے گناہ نہیں کہ (حج میں) خدا کی روزی کو تلاش کرو۔

اسی لئے خدا کی روزی تلاش کرنے والے حاجیوں کے لئے راستوں کے امن کا حکم دیا گیا، فرمایا:

**يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَا آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا.** (مائدہ/۲) اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی بے توقیری نہ کرو اور نہ حرمت والے (حج کے) مہینے کی، اور نہ حج کی

قربانی کی اور نہ قربانی کے جانوروں کے پٹوں کی، اور نہ ان کی جو عزت والے گھر (کعبہ) کے قصد سے نکلے ہوں، اپنے پروردگار کے فضل (تجارت) اور اس کی رضامندی کی تلاش میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے اغراض میں ایک اہم غرض اس کا تجارتی اور اقتصادی پہلو ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ کو اس اعلان کا حکم ہوا تھا۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ. لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ. فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ. (سورج حج ۲۸) اور لوگوں میں حج کو پکار دے، وہ پیادہ اور ہر دبلی پتلی سواریوں پر ہر دور دراز راستہ سے تیرے پاس آئیں گے؛ تاکہ اپنے (دینی و دنیاوی) منافع کے مقاموں پر حاضر ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اللہ کا نام جانوروں پر لیں جو ہم نے ان کو روزی کیے، تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ کھاؤ اور بدحال فقیروں کو کھلاؤ۔

ان آیتوں میں خاص تصریح ہے کہ حج کے مقاصد میں سے ایک خاص مقصد یہ ہے کہ لوگ تجارتی و مالی منافع کے مقاموں پر اکٹھے ہوں اور باہم مبادلہ اور خرید و فروخت سے اقتصادی فائدے اٹھائیں، اسی لئے متعدد مفسروں نے آیت میں منافع سے مراد تجارت لی ہے، اور کسی نے مغفرت؛ مگر اکثروں نے ان دونوں کو شامل کیا ہے۔

آیت میں اس بات کی بھی تشریح ہے کہ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ جانوروں کی جو نعمت انسانوں کو ملی، اس کا وہ شکریہ ادا کریں اور اس مسرت اور جشن کے موقع پر خود اس کا گوشت کھائیں اور فقیروں اور مسکینوں کو کھلائیں، کہ وہ بھی اس خوشی میں شریک ہوسکیں، قربانی کا یہ مقصد نہیں کہ نفس جانور کی خونریزی خدا کو محبوب ہے یا اس کا گوشت اس کو پسند ہے، فرمایا:

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ. (حج ۳۷) اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہونچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اب معلوم ہوا کہ حج میں قربانی کی غرض ایک تو یہ ہے کہ اس جشن میں دعوت کا سامان ہو اور دوسری غرض یہ ہے کہ بدحال فقیروں کو کھلایا جائے، اس لئے قربانی کے اتنے حصے کے علاوہ جو ذاتی صرف میں آئے بقیہ کل گوشت پوست سب فقیروں کو ہدیہ ہے۔

دولت کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں، زراعت، صنعت اور مویشی کی پرورش، عربوں کے پاس

زراعت نہیں، اور نہ صنعت ہی ہے، اس لئے دوسری قوموں کے تجارتی سامانوں کی دلالی کے بعد جو چیز ان کی دولت کا سرمایہ ہے، وہ جانوروں کی پرورش ہے، اور یہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے۔

بے مایہ عربوں کو بیت حرام کی اجرت اور ان کی اقتصادی امداد کا ذریعہ یا تو خیرات ہو سکتی تھی، جو حد درجہ ان کی دنائت اور پست حالی کو ہر حال میں بڑھاتی، جس طرح وہ آج کل خلاف شریعت خیرات لے لے کر تمام دنیا کی نگاہوں میں عربوں کی عزت کا بٹہ لگا رہے ہیں، یا کوئی دوسری صورت ہوتی، اسلام نے دوسری صورت نکالی اور وہ ان کی پرورش کے لئے تجارت، حاجیوں کا کرایہ مکان، حاجیوں کی خدمت کی مزدوری، حاجیوں کی سواری کی اجرت، اور دوسرے ذریعے مقرر کئے ہیں، انہی میں سے ایک قربانی بھی ہے۔

پہلے زمانہ میں پانچ لاکھ حاجیوں کا تخمینہ ہوتا تھا اور اب ایک لاکھ ہے، ہر حاجی کم از کم ایک دنبہ یا بکرا قربانی کرتا ہے، بعض اونٹ کرتے ہیں، جس کی گو قیمت زیادہ ہوتی ہے؛ مگر اس میں شرکت بھی ہوتی ہے، بہرحال اوسطاً ایک لاکھ دنبہ رکھ لیجئے، ایک دنبہ کی قیمت اوسطاً چار روپئے ہوتی ہے، تو اس طرح اہل بادیہ عرب کو ہر سال حج میں کم از کم چار لاکھ روپئے تقسیم ہوتے ہیں، اور پہلے کے حساب سے بیس لاکھ روپئے تقسیم ہوتے تھے۔

غیر حاجی مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جو قربانی کرتے ہیں اس کا روپیہ بھی ہر ملک کے دیہاتی مسلمانوں کو پہنچتا ہے، ہندوستان میں گو اکثر قربانی کے جانور قصائیوں کے ذریعہ خریدے جاتے ہیں، مگر شاید مسلمانوں سے زیادہ نامسلمان مویشی کی پرورش کرتے ہیں، اور وہ فائدا ٹھاتے ہیں؛ مگر قصور کس کا ہے؟

جانور کا گوشت، پوست، ہڈی، سب کی قیمت بازار میں ہے، اور ان سب کا نفع زکوۃ کی طرح مستحقین کے لئے مخصوص ہے؛ اگر عرب یا حجاز کی حکومت اس کا مناسب انتظام نہیں کرتی اور اس کا نفع حاصل کر کے غریبوں کو نہیں دیتی تو یہ قصور اسلام کا نہیں مسلمانوں کا ہے، اس کے لئے اسلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں، مسلمانوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

عرب سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں کا حال گو نہیں معلوم؛ مگر اس کو ہندوستان پر قیاس کیا جا سکتا ہے، ہندوستان میں کروڑوں مسلمانوں میں ۸/ لاکھ قربانیاں ہوں گی اور آٹھ لاکھ کھالوں کی قیمت اگر آٹھ ہی لاکھ کم وبیش رکھی جائے تو یہ ۸/ لاکھ روپئے سالانہ عربی مدرسوں، مکتبوں قومی اداروں

اور شہر و دیہات کے غریبوں میں بانٹے جاتے ہیں؛ اگر ہر سال ان آٹھ لاکھ روپیوں کے جمع و خرچ کا ٹھیک انتظام نہیں کیا جاتا ہے، تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے، پھر بھی یہ معلوم ہے کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے کئی مہینوں کے اخراجات اس قربانی کی مد سے پورے ہوتے ہیں۔

جشن قربانی کے اظہار کے لئے کوئی ایسا طریقہ جس میں جشن کا اظہار ہو، باہم دوستوں کی سادہ دعوت اور ہدیہ کا اانتظام ہو اور پھر غریبوں اور مسکینوں اور قومی ضرورتوں کا فنڈ بھی اس سے قائم ہو، **فديناه بذبح عظيم** کا مصداق بھی ہو، قربانی کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

آج کل مہذب سلطنتوں میں ٹیکس کے دو طریقہ ہیں، ایک براہ راست ٹیکس جیسے انکم ٹیکس، دوسرا بواسطہ ٹیکس، جس طرح ہم اس سلطنت میں ہر چیز پر ہر وقت ٹیکس ادا کر رہے ہیں؛ مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ براہ راست ٹیکس ہمیشہ گراں گذرتا ہے، اور بواسطہ ٹیکس کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا، یہی سبب ہے کہ جتنے لوگ زکوۃ ادا کرتے ہیں، اس سے زیادہ لوگ قربانی دیتے ہیں، اسلام نے ان دونوں ٹیکسوں سے کام لیا ہے، زکوۃ براہ راست انکم ٹیکس ہے، اوقربانی بواسطہ ٹیکس ہے اور اسکی ادائیگی کا راز اسی قربانی پر پیچ رمز میں ہے؛ اگر کوئی اس دینی راز کے نفسیاتی فلسفہ کو کھول کر اس کو نقد روپے سے بدلنا چاہے تو وہ دیکھے گا کہ چند ہی سال میں یہ منتر بے اثر اور عیدالاضحیٰ کا فلسفہ باطل ہو جائے گا، اور وہ روز جشن نہیں؛ بلکہ تحصیل وصول کا ناگوار دن بن جائے گا۔

الغرض قربانی بہت سے نفسیاتی، روحانی اور مادی اقتصادی فوائد پر مبنی ہے اور اس میں جو کمی نظر آتی ہے وہ مسلمانوں کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اصلاح کریں، اسلام کی اصلاح نہیں، کہ وہ ہر اصلاح سے پاک و بلند ہے۔

نہ سکت ہے ضبط غم کی نہ مجال اشکباری — یہ عجیب کیفیت ہے نہ سکوں نہ بے قراری
ترا ایک ہی ستم ہے ترے ہر کرم پہ بھاری — غم دو جہاں سے دے دی مجھے تو نے رستگاری
مری زندگی کا حاصل ترے غم کی پاسداری — ترے غم کی آبرو ہے مجھے ہر خوشی سے پیاری
یہ قدم قدم بلائیں یہ سواد کوئے جاناں — وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری
ترے جاں نواز وعدے مجھے کیا فریب دیتے — ترے کام آ گئی ہے مری زود اعتباری
مری رات منتظر ہے کسی اور صبح نو کی — یہ سحر تجھے مبارک جو ہے ظلمتوں کی ماری

عامر عثمانیؒ

# بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا

مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ

لیجیے منشور احسان وکرم آہی گیا

اے دل بے صبر لے اذن عام آہی گیا

ادھر جہاز بھرا، ادھر جہاز کا زینہ اٹھایا گیا، جہاز کے عرشہ پر ہزاروں حجاج اپنے پہونچانے والوں، عزیزوں، دوستوں کو وداعی سلام کررہے ہیں، جانے والوں پر ایک ایسا کیف وسرور ہے جوان کو بے خود بنائے ہوئے ہے، پہونچانے والے دوستوں اور عزیزوں کے دلوں پر حسرت وافسوس کا بادل چھایا ہوا ہے، وہ اپنی محرومی اور جانے والوں کو خوش نصیبی پر دل کو قابوں میں نہ رکھ سکے، سلام کے لئے زبان کھولی تو دل بھر آئے، نظر بھر کے دیکھنا چاہا تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں، ہر اک بے تاب وبے قرار، گلوگیر آواز سے درخواست کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔

ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر جب دربار میں آئے

ذرا ادھر نظر کیجئے کتنا رقت آمیز ہے وہ منظر، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دبلا پتلا؛ مگر سیماب کی طرح تڑپ رہا ہے، مجمع بڑھتا جارہا ہے پولیس اس کو رسی سے جکڑے جہاز سے دور کررہی ہے؛ مگر وہ اتنا بے تاب وبے قرار ہے کہ اس کو کوئی سد، بدھ نہیں، ہوش وہواس غائب، وہ کسی کی نہیں سنتا نہ کسی کی بات پر کان دھرتا ہے، بس ایک دھن ہے اور ایک لگن، مجھ کو جانے دو یا مجھ کو سمندر میں کودنے دو۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہوش کے ناخن لو اور عقل کی بات کرو؛ کیوں جان دیتے ہو، لوگ ہنستے ہیں اور اس کی حماقت پر آوازیں کستے ہیں؛ لیکن وہ اپنے ہوش میں نہیں اس کی آواز گلوگیر ہے وہ کتنے درد وکرب سے پہلو بدلتا ہے اور زبان حال سے کہہ اٹھتا ہے۔

جب پیت بھئی تب لاج کہاں سنسار ہنسے تو کیا ڈر ہے

دکھ درد پڑے تو کیا خپتا اور سکھ نہ رہے تو کیا ڈر ہے

جہاز نے سیٹی دی، ساحل کے لوگ چھٹنے لگے اور دیکھتے دیکھتے پولیس اس کو ساحل سے ہٹا لے گئی، اس منظر سے ہر ایک کا دل بھر آیا اور رنج وغم کی فضا قائم ہوگئی۔

جہاز ساحل سے دور ہونا شروع ہوا ساحل پر کھڑے لوگوں کے ہاتھ ہلتے اور رومال ہوا میں لہراتے نظر آرہے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے اللہ اکبر کی آواز ابھرتی اور فضا میں گونجتی ہوئی سنائی دے رہی ہے، اب ہر طرف پانی ہی پانی ہے آبادی نظروں سے دور، اوپر آسمان نیچے سمندر اور سمندر پر کئی ہزار ٹن کا بھاری جہاز ایک پتہ کی طرح بہا چلا جا رہا ہے۔

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا

سرافگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

دریائی سفر کو کئی دن گزر چکے ہیں، جو لوگ لہروں کے اتار چڑھاؤ اور جہاز کے ڈگمگانے سے بیمار ہو گئے تھے ان کی حالتیں معمول پر آگئیں ہیں، ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہے، لوگ دھوپ لینے عرشہ پر لیٹے بیٹھے ہیں، سامنے کچھ چھوٹی چھوٹی چڑیاں اڑتی نظر آنے لگیں، دل خوشی و مسرت سے جھوم اٹھے کہ خشکی قریب ہے؛ مگر دیکھتے دیکھتے وہ ساری کی ساری لہروں میں غائب ہو گئیں، معلوم ہوا کہ یہ چڑیاں نہیں اڑنے والی مچھلیاں ہیں جو پانی سے نکل کر دو چار گز اڑتی ہیں پھر پانی میں غائب ہو جاتی ہیں۔

کچھ اور آگے بڑھے تو بلندی پر سچ مچ کی بڑی بڑی چڑیاں اڑتی نظر آئیں کہنے والے نے کہا کہ خشکی قریب ہے، یہ چڑیاں ساحل سے اڑ اڑ کر آتی ہیں، پھر واپس چلی جاتی ہیں، ان کا اڑنا خشکی کے قریب ہونے کی علامت ہے۔

مبارک ہو کہ عرب کی زمین نظر آئی ہم بحر احمر میں ہیں، دائیں جانب عرب کی زمین ہے، بائیں جانب صحرائے افریقہ، خشکی کیا نظر آئی، مرجھائے ہوئے دلوں میں تازگی آئی اور کمھلائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔

جہاز رکا چھوٹی چھوٹی کشتیاں جہاز سے آکر لگ گئیں، ملاح کشتیوں سے کود کر تیرنے لگے، حجاج پیسے پھینکتے جاتے تھے اور ملاح جن میں بوڑھے بھی ہیں بچے بھی، غوطہ لگا لگا کر پیسے منہ میں دبائے پانی سے نکلتے ہیں، اور پھینکنے والے حاجیوں کو اپنا کمال دکھا کر مسرور کرتے ہیں، حجاج جنگلے سے لگے چھوٹی چھوٹی ڈلیاں رسی سے باندھ کر کشتیوں پر پھینکتے ہیں اور ملاحوں سے سپیاں گھونگھے، تربوز اور کھانے کی چیزیں خریدتے جاتے ہیں، سامنے ساحل پر مکانات، مینارے اور بالشت بھر جیسے چلتے پھرتے آدمی نظر آرہے ہیں، جن کے پاس دوربینیں ہیں، وہ جہاز پر کھڑے خشکی کی سیر کر رہے ہیں۔

لیجیئے جہاز پھر چلا اب یلملم کی آمد آمد ہے، لوگ احرام باندھنے کی تیاری میں لگے ہیں، ادھر

بگل بجا لوگوں نے غسل کیا، دو سفید چادریں بدن پر ڈالیں، دو رکعت نماز ادا کی، احرام کی نیت کی اور **لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد و النعمة لک لا شریک لک** سے پورا جہاز گونج اٹھا، لوگوں کے دل بدل گئے، اب پورا جہاز ایک مسجد اور ایک خانقاہ معلوم ہونے لگا، اب کسی کو کسی سے کام نہیں، نام ہے تو خدا کا، کام ہے تو خدا کی بندگی کا، زبانوں پر ذکر جاری آنکھوں سے آنسو رواں اور دلوں میں محبت وخوف کے ملے جلے جذبات۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام اپنے ہی کام سے<br>
ترے ذکر سے تری فکر سے تری یاد سے ترے نام

جدہ جتنا قریب آتا جاتا ہے، اتنے ہی دلوں کی کیفیتیں بدلتی جاتی ہیں، اک کشش ہے جو مقناطیس کی طرح دلوں کو کھینچ رہی ہے، رات کو نیند نہیں آئی، دن کا سکون اڑ گیا۔

دن گذرا رات بسر ہوئی، صبح ہونے کو آئی کہ کسی نے خبر دی کہ جدہ آنے والا ہے، کیف وسرور کے دن آئے، جہاز کے عرشہ پر سیکڑوں آدمی کس جذب وشوق سے جدہ کے ساحل کے انتظار میں کھڑے ہیں۔

اللہ اللہ اثر انگیزیٔ جذب غم کیف<br>
ٹپکا پڑتا ہے نگاہوں سے مری عالم کیف

وہ دیکھئے جدہ نظر آنے لگا، ساحل کی عمارتیں ایک کھڑکی کی طرح معلوم ہونے لگیں اور دیکھتے دیکھتے ساحل پر جہاز آ لگا، ہر ایک جوش ومستی میں ڈوب گیا۔ سامان کمروں سے باہر نکلا اور نیچے ایک ہلچل مچ گئی، لوگ بے تاب اور بیقرار نگاہوں سے پیارے ملک کے پہلے شہر کو دیکھنے لگے، اور اپنی قسمت پر رشک کرنے لگے، عربی سپاہی جہاز پر چڑھے، حجاج اوران کا سامان ساحل پر اترا کسٹم والوں نے سامانوں کی جانچ پڑتال کی اور چند گھنٹوں میں ساحل سے جدہ کے بازار میں آ گئے۔

☆-----☆-----☆

# ماہ ذی الحجہ کی فضیلت قرآن وحدیث کی روشنی میں

مولانا زاہر منظور اعظمی

مدرسہ فیض القرآن کشٹاپور، حیدر آباد

اسلامی سال کا آغاز ماہ محرم الحرام سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ماہ ذی الحجہ پر ہوتا ہے اللہ سبحانہ وتعالی نے ہر ماہ میں کوئی نہ کوئی فضیلت و اہمیت رکھی ہے لیکن کچھ مہینے ایسے بھی ہیں جن کی فضیلت واہمیت بالکل ظاہر ہے ارشاد باری تعالی ہے،

**"ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ یوم خلق السماوات والأرض منھا أربعۃ حرم "** (سورہ توبہ آیت ۳۶) ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے (محرم الحرام، رجب المرجب، ذوالقعدۃ اور ذوالحجہ) بڑے ہی محترم اور مقدس ہیں زمانہ جاہلیت میں بھی ان مہینوں کو عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان میں جنگ وجدال بالکل ممنوع تھا اور انفرادی لڑائی جھگڑے سے بھی وہ لوگ احتراز کیا کرتے تھے حتی کہ بوقت قتل وقتال ان میں سے کوئی مہینہ آجاتا تو اسے موقوف کردیتے یا اس مہینے کو مقدم و مؤخر کر دیتے تھے جیسا کہ قرآن میں اس کی وضاحت موجود ہے:

**یُحِلُّونہ عاما و یُحرِّمونہ عاما لِیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ** "(سورہ توبہ آیت ۳۷) ان چار مہینوں میں ایک مہینہ ماہ ذی الحجہ ہے جو اس وقت ہمارے اوپر سایہ فگن ہے اس مہینے کی فضیلت واہمیت اور بابرکت ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ دین اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک رکن یعنی حج اسی ماہ میں ادا ہوتا ہے اس ماہ ذی الحجہ کے عشرہ اول کی دس راتوں کی اللہ نے قسم کھائی ہے "**ولیال عشر** "(سورہ فجر آیت ۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ولیال عشر سے مراد ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں، یہ بات تو بالکل عیاں ہے کہ بندوں کو کسی کے سامنے اپنی بات منوانے اور پختہ کرنے کیلئے قسم کھانے کی ضرورت پڑتی ہے اور اللہ کی ذات ان سب چیزوں سے بے نیاز اور مستغنی ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کا قسم کھانا یہ اس کی اہمیت اور بابرکت ہونے کی طرف اشارہ اور دلیل ہے اور جس چیز کی قسم اللہ پاک کھائیں تو اس کے

معظم ومکرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

قرآن مجید میں اللہ کا ارشاد ہے ”**ویذکروا اسم الله فی أیام معلومات**“ اور یاد کریں اللہ کا نام معلوم دنوں میں (سورہ حج آیت/۲۸) اس آیت میں **أیام معلومات** سے مراد ایک قول کے مطابق عشرہ ذی الحجہ ہے جیسا کہ امام بخاری علیہ الرحمہ نے ذکر کیا ہے ”**وقال ابن عباس واذکروا الله فی أیام معلومات أیام العشر والأیام المعدودات أیام التشریق**“ یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ **أیام معلومات** سے مراد ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن ہیں اور **أیام معدودات** سے مراد أیام تشریق ہیں (صحیح البخاری) اللہ کا ذکر کرنا تو ہر روز بندوں پر ہے لیکن اللہ کا اپنی یاد کیلئے کچھ دنوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمانا یقیناً ان دنوں کی عظمت ورفعت کو اجاگر کرتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے ”**عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما من أیام أعظم عند الله ولا أحب الی الله العمل فیهن من أیام العشر فأکثروا فیهن من التسبیح والتهلیل والتحمید والتکبیر**، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ کے نزدیک عشرہ ذی الحجہ سے زیادہ عظمت والا کوئی دن نہیں اور نہ ان دنوں کے عمل سے اور کسی دن کا عمل زیادہ محبوب ہے لھذا تم لوگ ان دنوں میں تسبیح وتہلیل اور تحمید وتکبیر کثرت سے کیا کرو“ (رواہ الطبرانی) حدیث شریف میں تسبیح سے سبحان اللہ، تہلیل سے لا الہ الا اللہ، تحمید سے الحمد للہ اور تکبیر سے اللہ اکبر کہنا مراد ہے، ماہ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو یوم عرفہ (عرفہ کا دن) کہتے ہیں ان دس دنوں کے اعمال کے سب سے زیادہ محبوب ہونے کی ایک وجہ یہی ہے کہ یوم عرفہ انہیں دنوں میں آتا ہے اور افعال حج بھی انہیں ایام میں ادا ہوتے ہیں ایک حدیث شریف میں ارشاد ہے ”**عن عائشة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما من یوم أکثر من أن یعتق الله فیه عبدا من النار من یوم عرفة و انه لیدنو ثم یباهی بهم الملائکة فیقول ما أراد هؤلاء**، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ عرفہ کے دن سے زیادہ کسی دن اپنے بندوں کو دوزخ سے آزاد نہیں کرتا اور اللہ اپنے بندوں سے قریب ہوتا ہے پھر فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں پر فخر کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے کہ یہ بندے کیا چاہتے ہیں (رواہ الترمذی)۔

بقیہ صفحہ/٦ پر۔۔۔

# آپ ﷺ کی ختم نبوت دلائل کی روشنی میں

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قاسمی اعظمی

فاضل دارالعلوم دیوبند

بحیثیت مسلمان ہر شخص کا اعتقاد ہے کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت وراہنمائی کے لیے لئے انبیاء کا ایک سلسلہ جاری فرمایا، جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور وہ سلسلہ ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفی ﷺ پر آ کر منتہی ہو گیا، نبیوں کے اس پورے سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرنا مذہب اسلام کے ان لازمی اجزاء میں سے ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی ناممکن اور محال ہے، عقیدۂ ختم نبوت اسلام کی اساس و بنیاد ہے، یہ عقیدہ اسلام کے لیے اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا کہ اللہ کی توحید کو ماننا، نبیوں پر ایمان لانا، قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا اقرار کرنا۔

جس طرح اللہ کی الوہیت و ربوبیت میں کسی کو شریک کرنے سے آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے ایسے ہی حضور ﷺ کے بعد کسی نئے نبی کے امکان محض سے بھی آدمی کا ایمان باقی نہیں رہتا، بلکہ اسلامی تاریخ، اسلامی اصول تو یہاں تک کہتے ہیں کہ منکرین توحید چند شرطوں کے ساتھ جیسے جزیہ وغیرہ کے ساتھ اسلامی سلطنت میں مقیم ہونے کا توحق رکھتے بھی ہیں؛ مگر منکر عقیدۂ ختم نبوت کسی بھی حال میں اسلام سے رواداری کی امید نہ رکھیں، عقیدہ ختم نبوت پر اسلام کا یہ سخت رویہ اس عقیدے کی اہمیت بتانے کے لیے کافی ہے۔

دلیل عقلی سے لیکر دلیل شرعی تک، قرآن کی آیتوں سے لیکر احادیث کی صراحتوں تک، اور امت کے اجماع وتواتر سے لیکر اکابر واسلاف کی وضاحتوں تک آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے پر دلیلوں کا وہ انبار موجود ہے جس کا انکار یا جس کی تاویل وتخصیص روئے زمین پر بسنے والے کسی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں۔

## عقیدۂ ختم نبوت قرآن کی روشنی میں

(۱) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ . وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا. محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ

اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ سلسلہ نبوت کو محمد عربی ﷺ پر ختم کر دیا گیا، آپ کے بعد اب کسی بھی شخص کو خلعت نبوت سے سرفراز نہیں کیا جا سکتا، ورنہ بصورت دیگر آپ ﷺ کو نبیوں کا خاتم کہنا چہ معنی دارد؟

(۲) وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَـٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ۔ مجھ پر یہ قرآن وحی کیا جاتا ہے تاکہ میں تم کو بھی ڈراؤں، اور ان لوگوں کو بھی ڈراؤں جن تک یہ پیغام پہونچے۔

اس آیت میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا کہ قرآن ہر اس شخص کو مخاطب بناتا ہے جس کے کانوں تک قرآن کا پیغام پہونچے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کو عالمگیر و آفاقی مانا جائے، آپ ﷺ کی نبوت کو کافة للناس بشیرا و نذیرا کا مصداق قرار دیا جائے۔

## عقیدۂ ختم نبوت احادیث کی روشنی میں

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه، أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنَّ مَثَلي ومثلَ الأنبياء منْ قَبلي، كَمَثَلِ رجلٍ بنى بَيْتًا، فأحْسَنَهُ وأجْمَلَهُ، إلا مَوْضعَ لَبِنَةٍ من زاوية، فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفونَ بِهِ، ويَعْجَبونَ له، ويقُولونَ: هَلَّا وُضِعَتْ هذه اللَّبِنَة؟، قال: فأنا اللَّبِنَة، وأنا خاتمُ النَّبيِّينَ؛ رواه الشيخان، واللفظ للبخاري. میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ہے ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک گھر بنایا اس کو بہت عمدہ اور خوبصورت بنایا مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ جوق در جوق آتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگا دی گئی آپ نے فرمایا وہ اینٹ میں ہوں اور میں انبیاء کا خاتم ہو۔

اس حدیث میں آپ نے سلسلۂ نبوت کو ایک محل سے تعبیر کیا، اور ماسبق انبیاء کو اس کی اینٹوں سے جو آپ کے بغیر نامکمل اور ادھوری ہے، جب آپ کی بعثت ہوگئی تو قصر نبوت بھی مکمل ہوگئی، یہ حدیث آپ ﷺ کی ختم نبوت پر صریح دلالت کررہی ہے، کیونکہ قصر نبوت آپ کے ذریعہ مکمل ہوگئی، اور مکمل ہونے کے بعد اب کسی اینٹ کا اضافہ اس عمارت کے حسن کو زائل کردے گا۔

(۲) اِنَّ لِیْ أَسْمَاءً، اَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَنَا أَحْمَدُ، وَاَنَا الْمَاحِي يَمْحُو اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ، وَاَنَا الْعَاشِرُ الَّذِیْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰی قَدَمَيَّ، وَأَنَا الْعَاقِبُ الَّذِیْ لَيْسَ بَعْدَه اَحَدٌ. بے

شک میرے کئی اسماء ہیں، میں محمد ہوں، میں احمد ہوں اور ماحی ہوں یعنی اللہ تعالیٰ میرے ذریعے کفر کو مٹائے گا اور میں حاشر ہوں لوگوں کا حشر میرے قدموں میں ہوگا، اور میں عاقب ہوں اور عاقب وہ شخص ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل)

(۳) **نَحنُ الْاٰخِرُوْنَ وَنَحنُ الْأَوَّلُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَنَحْنُ اَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ، بيدأ أَنَّهُمْ أُوْتُوْا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِنَا وَاُوْتِيْنَاهُ مِنْ بَعْدِهِمْ.** ہم سب آخر والے روزِ قیامت سب سے مقدم ہوں گے اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ حالانکہ (پہلے والوں) کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہمیں ان سب کے بعد۔ (صحیح مسلم، کتاب الجمعہ)

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ حضور خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: **لَمْ يَبْقَ مِنَ النَّبُوَّةَ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا، وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ: الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ.** نبوت میں سے (میری وفات کے بعد) کچھ باقی نہ رہے گا مگر خوش خبریاں رہ جائیں گی۔ لوگوں نے عرض کیا خوشخبریاں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا اچھے خواب۔

(صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب المبشر ات، حدیث: ۶۹۹۰)

## عقیدہ ختم نبوت اجماع کی روشنی میں

(۱) جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی تو اس کے بعد بہت سے فتنوں نے سر اٹھایا جن میں منکرین زکوۃ کا فتنہ بھی تھا۔ صحابہ کرامؓ نے منکرین زکوۃ کے خلاف بھی جہاد کیا لیکن جہاد کرنے سے پہلے اس پر بحث ومباحثہ بھی ہوا کہ منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد کیا جائے یا جہاد نہ کیا جائے، جب صحابہ کرامؓ متفق ہو گئے تو پھر منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد ہوا۔

لیکن جب مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جہاد کا حکم دیا تو کسی ایک صحابی نے یہ نہیں کہا کہ وہ کلمہ گو ہے اس کے خلاف جہاد نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ تمام صحابہ کرامؓ نے مسیلمہ کذاب اور اس کے پیروکاروں کو کفار سمجھ کر کفار کی طرح ان سے جہاد کیا اور مسیلمہ کذاب کو قتل کرنے کی وجہ صرف اس کا دعوی نبوت تھا؛ کیونکہ ابن خلدون کے مطابق صحابہ کرامؓ کو اس کی دوسری گھناونی حرکات کا علم اس کے مرنے کے بعد ہوا۔ اور یہی صحابہ کرامؓ کا عقیدہ ختم نبوت پر اجماع ہے

(۲) ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: **دعوی النبوة بعد نبينا ﷺ كفر بالاجماع.** ہمارے نبی ﷺ کے بعد نبوت کا دعوی کرنے والا امت کے اجماع سے کافر ہے۔ (الفقہ الاکبر/صفحہ/۱۵۰)

(۲)امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ: **انّ الاُمّتہ فھمت بالاجماع من ھذا الفظ ومن قرائن احوالہ انہ افھم عدم نبی بعدہ ابدا وانہ لیس فیہ تاویل ولا تخصیص فمنکر ھذا لایکون الا منکر الاجماع.** "بیشک امت نے بالاجماع اس لفظ (خاتم النبیین) سے یہ سمجھا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی ہوگا اور نہ کوئی رسول ہوگا اور اس پر اجماع ہے کہ اس لفظ میں کوئی تاویل و تخصیص نہیں، پس اس کا منکر یقیناً اجماع امت کا منکر ہے"۔

الاقتصاد فی الاعتقاد/صفحہ/۱۷۸

(۴) علامہ آلوسیؒ ختم نبوت پر امت کیا اجماع کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: **وکونہ ﷺ خاتم النبیین مما نطقت بہ الکتاب وصدعت بہ السنتہ واجمعت علیہ الامتہ فیکفر مدعی خلافہ ویقتل ان اصر.** " آنحضرت ﷺ کا خاتم النبیین ہونا ان مسائل میں سے ہے جس پر کتاب (قرآن) ناطق ہے اور احادیث نبوی ﷺ اس کو بوضاحت بیان کرتی ہیں۔ اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے۔ پس اس کے خلاف کا مدعی کافر ہے اگر وہ توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے"۔

روح المعانی/جلد ۲۲/صفحہ/۴۱

(۵) قاضی عیاضؒ نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ اس کے دور میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا، تو خلیفہ نے وقت کے علماء جو تابعین میں سے تھے ان کے فتوی سے اس کو قتل کروادیا۔ قاضی صاحب اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: **وفعل ذالک غیر واحد من الخلفاء والملوک باشباھھم واجمع علماء وقتھم علی صواب فعلھم والمخالف فی ذالک من کفرھم کافر .** " اور بہت سے خلفاء سلاطین نے ان جیسے مدعیان نبوت کے ساتھ یہی معاملہ کیا ہے۔ اور اس زمانے کے علماء نے ان سے اس فعل کے درست ہونے پر اجماع کیا ہے۔ اور جو شخص ایسے مدعیان نبوت کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے"۔

شرح الشفاء/جلد/۲ صفحہ/۵۳۴

## عقیدہ ختم نبوت عقل کی روشنی میں

اگر حضور ﷺ کے بعد بھی کسی نبی کی گنجائش رہے گی تو آیا اس کی شریعت ہماری شریعت و احکام کی مخالف ہوگی یا موافق؟ اگر مخالف ہوئی تو سوال یہ ہے کہ وہ ہماری شریعت کو منسوخ کرے گی یا نہیں، اگر تم کہتے ہو کہ وہ نبی ہماری شریعت کو منسوخ کر دے گا تو تمہاری یہ بات قرآن کی آیت

**مانسخ من آیة او ننسها نات بخیر منها او مثلها** کے معارض ہے، کیوں کہ قرآن کی یہ آیت کہتی ہے کہ کسی چیز کو منسوخ کرنے کے لئے لازم ہے کہ ناسخ اپنے منسوخ سے افضل ہو یا کم از کم اس کے برابر ہو، اور یہاں یہ شرط مفقود ہے۔

اگر تم کہتے ہو کہ وہ نیا نبی ہماری شریعت کو منسوخ نہیں کرے گا؛ بلکہ بعض علاقے میں اس کی شریعت پر عمل کیا جائے گا اور بعض علاقوں میں ہماری شریعت پر، تو تمہاری یہ بات قرآن کی ایک دوسری آیت **انی رسول الله الیکم جمیعا** کے معارض ہے، کیوں کہ اس آیت سے پتہ چل رہا ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت آفاقی، عالمگیر ہے اور تم نے اس کو بعض علاقوں میں محدود کر دیا، اگر اس نبی کی شریعت ہماری شریعت کے موافق ہوئی تو سوال یہ ہے کہ کیا جو کچھ بھی ہمارے نبی پر نازل کیا گیا ہے من وعن وہی چیزیں اس نبی پر بھی نازل کیا جائیگا یا اس سے کچھ زائد چیزیں؟

اگر تم کہتے ہو کہ من وعن وہی چیزیں نازل کی جائے گی تو تمہاری یہ بات قرآن کی آیت **انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون** کے مخالف ہے کیوں کہ کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ لینا اس بات کی دلیل ہے کہ اب ایسی چیز نازل نہیں کی جایے گی، حالانکہ تمہارے بقول ابھی ایک اور شریعت ہے جو انھیں اوامر ونواہی پر مشتمل ہے۔

دوسری بات شریعت محمدیہ کا اللہ کی حفاظت میں ہونا یہ اس کی خصوصیت ہے اور تمہارے بقول بعد والی شریعت بھی انھیں احکام وقوانین اوامر ونواہی پر مشتمل ہے تو اس کا مطلب اب اس کی بھی حفاظت اللہ کے ذمہ ہوگی، ایسے میں یہ ہماری شریعت کی خصوصیت کہاں باقی رہی۔

اگر تم کہتے ہو کہ اس نئی شریعت میں کچھ زائد چیزیں، کچھ مزید فوائد بھی ہونگے تو تمہاری یہ بات قرآن کی آیت **تبیانا لکل شیء** کے مخالف ہے کیوں کہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں جتنی بھی فائدے کی چیزیں تھیں، سب اس کتاب میں بیان کر دی ہے، اب تم کہہ رہے ہو کہ کچھ فائدے کی چیزیں نئی والی شریعت میں ہے۔

یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ یہ سارے محذورات اس وقت لازم آئیں گے جب ہم اس نبی کے لئے شریعت کو لازم قرار دیں، ماضی میں بہت سے ایسے نبی گزرے ہیں جن کے پاس اپنی کوئی شریعت نہیں تھی جیسے حضرت ہارون، حضرت یوشع بن نون علیہما السلام سو یہاں بھی وہ نیا نبی بغیر شریعت کے حضور ﷺ کی شریعت پر عمل کرے گا اور اسی کی تبلیغ کرے گا۔

یہ سوال اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ نبی جب نئی شریعت لیکر نہیں آئے گا تو اس کی بعثت کا مقصد امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی ہوگا، اور اللہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے اس امت

کے ہر فرد کو مکلّف بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے، **کنتم خیر امہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون المنکر** تو جس کام کے لیے اللہ نے امت کے ہر فرد کو مکلّف بنایا ہے اس کے نئے نبی کی کوئی حاجت وضرورت نہیں۔ (مستفاد تحذیر الناس مؤلفہ قاسم نانوتوی)

## ادیان سابقہ میں حضور ﷺ کا ذکر بحیثیت آخری نبی

حضور اکرم ﷺ سے پہلے جتنے بھی نبی تشریف لائے ہر ایک نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت کے ساتھ ساتھ حضور اکرم ﷺ کا ذکر خیر ضرور کیا ہے، اور بعض جگہوں پر یہ صراحت بھی کی گئی کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں، اگر یہ صراحت نہ ہوتی تب بھی تمام ادیان و مذاہب آپ ﷺ کا ذکر خاص ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ سلسلۂ نبوت میں انتہائی اہمیت کے حامل اور اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔

(۱) بنی قریظہ اور بنی نضیر کے علماء یہود جب نبی اکرم ﷺ کی صفات کا تذکرہ کرتے تو یہ بھی کہتے: **انہ نبی و أنہ لانبی بعدہ، و اسمہ احمد.** بلاشبہ یہ نبی ہیں، اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، توریت وانجیل میں ان کا نام احمد ہے۔ (خصائص للسیوطی بحوالہ ختم نبوت للکاندھلوی)

(۲) جب ہرقل شاہ روم کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا والا نامہ بھیجا جس کا مفصل قصہ صحیحین میں مذکور ہے۔ اسی قصہ میں ایک روایت یہ ہے کہ اس نے رات کے وقت صحابہ کے وفد کو بلایا، اور ایک سونے کا صندوقچہ نکالا جس پر قفل بھی سونے ہی کا تھا، اس صندوقچے میں بہت سے خانے تھے، جس میں ریشمیں پارچوں پر تصویریں تھیں، بادشاہ نے وہ تصویریں دکھائیں اور اخیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر دکھائیں ہم نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ محمد الرسول اللہ کی تصویر ہے۔ **فذکر انها صور الانبیاء، و أنہ خاتمهم.** اس پر بادشاہ نے کہا کہ انبیاء کی تصویریں ہیں اور یہ آخری تصویر خاتم الانبیاء کی ہے۔ (فتح الباری بحوالہ ختم نبوت مولانا کاندھلوی)

## ہندومت اور حضور ﷺ

پنڈت وید پرکاش جی اپنی کتاب ''کلکی اوتار اور محمد صاحب'' میں رقم طراز ہیں ''گیتا وید' پرانوں کی تحقیق کے مطابق جس طرح محمد ﷺ مسلمانوں کے آخری نبی ہیں، اسی طرح ہندوؤں کے آخری اوتار بھی تھے''۔

ہندو مت میں آخری اوتار کی جو خصوصیت بتائی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) پرانوں میں آخری اوتار کی سواری گھوڑا بتائی گئی ہے، وہ گھوڑا تیز رفتار ہوگا، اس گھوڑے کی صفت میں ''دیودت'' نام آیا ہے یعنی دیوتا کا عطیہ (براق کی طرف اشارہ ہے)

(۲) آٹھ الٰہی صفات سے آراستہ ہوگا، علم و دانائی، عالی نسبی، نفس پر قابو یافتہ، حاملِ وحی، طاقتور، بہادر، کم سخن، صدقہ خیرات کرنے والا، شکر گزار اور احسان مند

(۳) دنیا کا محافظ ''جگت پتی'' یعنی معلم عالم۔

(۴) آخری اوتار کی سب سے بڑی صفت یہ ہوگی کہ وہ بدکاری ہی کو مٹائیں گے اچھے لوگوں کو نہیں۔

(۵) جنگ میں ان کی مدد کے لیے دیوتا (فرشتے) بھی آسمان سے اتریں گے۔ (جنگ بدر میں نزول ملائکہ)

(۶) آخری اوتار کا جسم پرنور ہوگا اس جیسا پرنور کوئی دوسرا اوتار نہ ہوگا۔

(۷) آخری اوتار کے جسم سے خوشبو نکلے گی جو ہوا میں مل کر لوگوں کے دلوں کو نرم کرے گی۔ (حضرت انس رض، بیان کرتے ہیں کہ میں نے کوئی عطر حضور ﷺ کے پسینے کی خوشبو سے زیادہ اثر آفریں نہیں پایا)

(۸) آخری اوتار معاشرے کی عظیم اصلاح کریں گے۔

(۹) آخری اوتار کی پیدائش شمبھل کے خاص پروہت ''وشنوئس'' کے یہاں ہوگی اور ان کی والدہ کا نام ''سومتی'' ہوگا۔

(آپ ﷺ کی پیدائش شمبھل بتائی گئی ہے اس کے معنی ہیں ''امن کا گھر'' آپ کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی جو دار الامن ہے) وشنوئس کے معنی ہیں ''اللہ کا بندہ'' آپ کے والد گرامی کا نام عبداللہ تھا۔ والدہ کا نام سومتی بتایا گیا ہے جس کے معنی ہیں ''امن والی'' ''اچھے برتاؤ والی'' آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا نام آمنہ تھا جس کے معنی ہیں ''امن والی''۔ (کلکی اوتار اور محمد صاحب)

اسی طرح پارسی مذہب کی معتبر کتاب ''بنداحش'' میں حضور اکرم ﷺ کو آخری نبی کہا گیا ہے۔

(مذہبی کتابوں میں محمد ﷺ کا تذکرہ ڈاکٹر ذاکر نائیک)

# حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام: ایک تحقیق

مولانا وصی اللہ صاحب قاسمی سدھارتھ نگری

اشاعت العلوم کوٹلہ اعظم گڑھ

انبیاءؑ کی تاریخ میں حضرت ابراہیمؑ کا نام اور مقام بہت ہی نمایاں ہے، قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر مختلف حیثیتوں سے آپ کا تذکرہ موجود ہے، سیرت ابراہیمی کا ایک روشن پہلو وہ بھی ہے جس کا قرآن نے بڑے ہی عبرت آمیز انداز میں تذکرہ کیا ہے: **واذ قال ابراھیم لأبیه آزر اتتخذ اصناما آلھة انی أراک و قومک فی ضلال مبین ) سورة الانعام/ ۷۴)** قرآن پاک نے اس آیت سمیت اگلی آیات میں حضرت ابراہیم کا اوقعہ نقل کر کے امت محمدیہ (علی صاحبہا الف الف سلام) کو استقامت علی التوحید کا درس دیا ہے، سردست اس واقعہ میں پنہاں اسرار و رموز سے بحث مقصود نہیں ہے۔

مذکورہ آیت، قرآن مجید کی وہ آیت ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کی نسبت ان کے والد کی طرف کی گئی ہے، اس نسبت کے ساتھ قرآن نے ایک نام (آزر) بھی نقل کیا ہے، لیکن آیت میں بظاہر کوئی ایسی کوئی دلیل نہیں جس کی بناء پر دیگر دلائل کا رد کرتے ہوئے قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکے کہ یہی (آزر) حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تھا، اس لئے فطرتاً ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام کیا تھا؟ محققین کے مابین یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے چنانچہ محققین و مفسرین کے اقوال کا اگر خلاصہ کیا جائے تو بنیادی طور پر دو قول سامنے آتے ہیں۔

**قول اول:** حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ''تارح'' یا ''تیرح'' (بالحاء) یا ''تارخ'' (بالخاء) ہے، اس قول کے قائلین میں امام زجاجؒ، مقاتل بن حیانؒ، ابن جریرؒ، سدیؒ اور ماہرین علم الانساب کے ساتھ ایک انتہائی اہم اور معتبر نام حضرت ابن عباسؓ کا بھی ہے، حافظ ابن کثیر دمشقیؒ (متوفی ۷۷۴ھ) ماہرین علم الانساب حضرت ابن عباسؓ کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

**و جمھور اھل النسب منھم ابن عباسؓ علی ان اسم ابیه تارح (بالحاء)**
یعنی حضرت ابن عباسؓ سمیت جمہور اہل نسب کا قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ''تارح''

جبکہ اہل کتاب ''تارخ'' کہتے ہیں(۱)۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں حضران عباسؓ کے اس قول کی دوسندیں نقل کی ہیں:(۱) **قال الضحاکؒ عن ابن عباسؓ: ان ابا ابراهيم لم يكن اسمه آزر و انما كان اسمه تارح.(۲) عكرمة عن ابن عباسؓ فی قوله : و اذ قال ابراهيم لابيه آزر، يعنی آزر بالضم ، و ابو ابراهيم اسمه تارح(۲)**

دونوں سندوں کا خلاصہ یہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح ہی تھا۔

امام زجاجؒ نے اسی قول پر ماہرین انساب کا اجماع بھی نقل کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں'' **و ليس بين النسابين خلاف ان اسم ابی ابراهيم تارح (۳)** یعنی ماہرین انساب کے مابین اس بات میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے کہ ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح ہے، اسی کو علامہ قرطبیؒ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: **و ليس بين الناس اختلاف فی ا ن اسم و ابی ابراهيم تارح.(۴)**

علامہ بغویؒ نے اپنے تفسیر میں اس قول کو مقاتل بن حیان کی جانب بھی منسوب کیا ہے، مزید یہ بھی کہا ہے کہ آزر، ابراہیمؑ کے والد کا نام نہیں، بلکہ لقب ہے، **وقال مقاتل بن حيان وغيره: آزر لقب لابی ابراهيم و اسمه تارح. (۵)**

سدیؒ کا قول نقل کرتے ہوئے علامہ جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں: **اخرج ابن ابی حاتم عن السدی قال : اسم ابيه تارح (۶)** اسی کے مطابق مشہور مفسر ابن جریج کا قول نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: **اخرج ابن المنذر عن ابن جريج فی قوله و اذ قال ابراهيم لابيه آزر ، قال : ليس آزر بابيه، انما هو ابراهيم بن تيرح(۷)**

<u>سوال</u>: مذکورہ حوالہ جات کی روشنی میں اگر حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ''تارح یا''تیرح'' مان لیا جائے تو اس صورت میں آیت کریمہ میں مذکور لفظ''آزر'' سے کیا مراد لیں گے اور آیت کا مفہوم کیا ہوگا؟

<u>جواب</u>: اس سوال کا جواب علامہ رازیؒ نے تفسیر کبیر میں دیا ہے کہ اس صورت میں ہم آیت کریمہ کو درج ذیل محامل میں سے کسی ایک پر محمول کر سکتے ہیں۔

(۱) آزر یا تارح دونوں حضرت ابراہیمؑ کے والد کے نام ہوں، علامہ قرطبیؒ نے علامہ ثعلبی

کی کتاب العرائس کے حوالہ سے اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابراہیمؑ کے دادا نے ان کے والد کا نام تو تارح ہی رکھا تھا، لیکن جب انہوں نے نمرود کی معیت اختیار کی تو نمرود نے ان کا نام آزر رکھ دیا۔(۸) جب کہ علامہ رازی بھی لکھتے ہیں کہ: ممکن ہے اصل نام تو تارح ہو البتہ آزر لقب ہو، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے لقب سے تو مشہور ہو جاتا ہے، لیکن اصل نام مخفی رہ جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ ''آزر'' عربوں کی زبان میں ''اسم ذم'' ہے یعنی اس لفظ کے ذریعہ کسی کی خطا اور غلطی کو واضح کیا جاتا ہے، یہاں بھی وہی مان لیا جائے، اس صورت میں ''آزر'' **المخطئ** کے معنی میں ہوا، اور آیت کا مطلب یہ ہوگا: **و اذ قال ابراهيم لابيه آزر المخطئ**۔ یعنی جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے خطا کار والد سے کہا۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ آزر بت کا نام ہو؛ لیکن اس صورت میں ایک سوال پیدا ہوگا کہ آخر اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام بت کے نام پر کیوں رکھا؟ اس کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔

(الف) جب کوئی شخص کسی سے حد درجہ محبت کرتا ہے تو بسا اوقات محبوب کے نام پر ہی محبّ کا نام رکھ دیا جاتا ہے؛ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے والد بھی آزر نامی بت سے حد درجہ محبت کرتے تھے، اسی لئے اللہ تعالی نے بت ہی کے نام سے ان کا تذکرہ کیا۔

(ب) آزر کو مضاف الیہ مانا جائے اور مضاف (عابد) محذوف مانا جائے اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ: **واذ قال ابراهيم لابيه آزر ای عابد آزر**، یعنی جب ابراہیمؑ نے آزر نامی بت کی عبادت کرنے والے اپنے والد سے کہا (۹) ان تینوں توجیہات کو امام رازیؒ نے نقل کیا ہے، تیسری توجیہ تفسیر کشاف میں بھی مذکور ہے۔(۱۰)

<u>قول ثانی</u>: دوسرا اور مشہور قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ''آزر'' تھا، اس قول کے قائلین میں ابو محمد ضحاک بن مزاحمؒ، ابو النصر محمد بن السائب الکلبیؒ کے ساتھ ایک معتبر نام امام المغازی محمد بن اسحاقؒ کا ہے، چنانچہ تفسیر خازن میں ہے: **و اختلف العلماء فی لفظ آزر فقال محمد بن اسحاق والكلبیؒ والضحاکؒ : آزر اسم ابی ابراهيم.** (۱۱) یعنی لفظ آزر میں علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ محمد بن اسحاق کلبیؒ اور ضحاکؒ کا قول ہے کہ آزر ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے؛ بلکہ علامہ ثعلبیؒ کے مطابق محمد بن اسحاقؒ وغیرہ کے نزدیک آزر اور تارح دونوں حضرت ابراہیمؑ

کے والد کے نام ہیں: **قال محمد بن اسحاقؒ و الضحاک و الکلبیؒ: و آزر ابو ابراھیم و ھو تارح مثل اسرائیل و یعقوب.** یعنی جس طرح حضرت یعقوبؑ کا نام اسرائیل بھی ہے، اسی طرح آزر کا نام تارح بھی ہے۔

بہر حال یہ تو مفسرین و محققین کا اختلاف تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک قول کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح، یا تارخ یا تیرح ہے، جب کہ دوسرے قول کے مطابق ان کا نام آزر ہے۔

## قول راجح:

اس اختلاف کو ذہن نشین کرنے کے بعد اگر قول راجح کی تعیین کی جائے تو مفسرین کا رجحان دوسرے قول کی جانب زیادہ نظر آتا ہے، چنانچہ امام رازیؒ نے پہلے قول کو نقل کر کے آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے جہاں چند محامل (جن کی وضاحت ماقبل میں آچکی ہے) کی جانب اشارہ کیا ہے، وہاں اخیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ: ان توجیہات کی ضرورت اس وقت پڑے گی، جب یہ طے ہو جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر نہیں تھا، حالانکہ یہ طے نہیں ہے کیوں نکہ ظاہر آیت اس کے برخلاف مشیر ہے۔(۱۳) اسی طرح حافظ ابن کثیر نے تفسیر ابن کثیر اور البدایہ والنہایہ دونوں میں مشہور مفسر ابن جریر کا ذاتی رجحان اسی کی جانب نقل کیا ہے۔(۱۴)

## وجہ ترجیح:

مفسرین کا رجحان اس دوسرے قول کی جانب ہونے کی تفسیر خازن میں ایک دلیل نقل کی گئی ہے، اولاً تو یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ظاہر آیت سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر تھا؛ لیکن کوئی خارجی دلیل اس کی مؤید نہیں تھی، البتہ جب حدیث نبوی میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر ہی نظر آیا تو گویا حدیث، قرآن کی تفسیر بن گئی اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر ہی ہے، رہی بات حدیث کی تو امام بخاریؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، الفاظ حدیث ملاحظہ ہوں:

**عن ابی ھریرۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : یلقی ابراھیمؑ اباہ آزر یوم القیامۃ و علی وجہ آزر قترۃ و غبرۃ.** (۱۵) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

قیامت میں حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آزر سے ملاقات کریں گے اور آزر کے چہرے پر ذلت و تاریکی اور غبار ہوگا۔

بہر حال ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر ہونے کی اس سے زیادہ اور کون سی واضح دلیل مل سکتی ہے۔

نوٹ:۔ بہر صورت یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام کچھ بھی ہو، اس میں کتنا بھی اختلاف ہو، نہ یہ عقیدے کا مسئلہ ہے اور نہ بنانا چاہئے، یہ محض ایک علمی اور تحقیقی مسئلہ ہے جس میں دلائل کی روشنی میں فکر و نظر کو کافی حد تک اختلاف کی گنجائش ہے۔

**اللهم اهدنا الى الصراط المستقيم. آمین**

(۱) البدایه و النهایه ۱/ ۱۴۲، لابی الفداء اسماعیل بن کثیر الدمشقی، مکتبة معارف، بیروت. ۱۴۱۰ھ (۲) تفسیر القرآن العظیم ۳/۵٦۴، ط: دار ابن الجوزی، بیروت، ۱۴۳۱ھ (۳)معانی القرآن و اعرابه ۲/ ۲٦۵، للزجاج ابو اسحق ابراهیم بن السری، ط: عالم الکتب، بیروت، لبنان ۱۴۰۸ھ(۴)تفسیر القرطبی ۸/ ۴۳۳ ۱۴۳۳ھ. لابی عبدالله محمد بن احمد بن ابی بکر القرطبی، ط: مؤسسة الرساله، بیروت، ۱۴۲۴ھ (۵)تفسیر البغوی ۳/ ۱۵۸ لابی محمد الحسین بن مسعود البغوی،ط: دار طیبة ریاض ۱۴۰۹ھ (٦) الدر المنثور ۳/ ۳۰۰ للامام عبدالرحمن بن الکمال جلال الدین السیوطی، ط: دارالفکر بیروت (۷) ایضا (۸)تفسیر القرطبی ۸/ ۴۳۴(۹)مفاتیح الغیب (تفسیر رازی) ۱۳/ ۴۰للامام فخرالدین محمد الرازی، ط: دار الفکر، بیروت (۱۰) تفسیر الکشاف ص/ ۴۳۴ لابی القاسم جار الله الزمخشری، ط: دار المعرفه، بیروت (۱۱) تفسیر الخازن المسمی: لباب التاویل فی معانی التنزیل ۲/ ۱۲۵ علاء الدین علی بن محمد البغدادی الشهیر بالخازن، ط: دارالکتب العلمیة، بیروت (۱۲)الکشف والبیان المعروف تفسیر الثعلبی ۴/ ۱٦۰: للامام ابو اسحق احمد المعروف بالامام الثعلبی، ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان (۱۳) مفاتیح الغیب (تفسیر رازی) ۱۳/ ۴۰ (۱۴)تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۳/ ۵۴٦ اور البدایه والنهایه ۱/ ۱۴۲ (۱۵) بخاری شریف، رقم:۳۳۵۰۔

☆-----☆-----☆

# امت مسلمہ کے لئے حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کی فکر و تڑپ ایک مکتوب کی روشنی میں

شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی
امام وخطیب مسجد انوار شواجی نگر گوونڈی ممبئی

دوسری اور آخری قسط

حضرت مولانا اعظمی کا قلب بھی انھیں حالات سے دوچار تھا، ملت پر جب بھی کوئی افتاد آتی یا اس کے گلزار ہستی پر جب بھی مصائب و آلام کے بادل چھاتے تو وہ تڑپ جایا کرتے تھے، امت کی زبوں حالی اس کی نکبت واد بار اور اس کی بدحالی و پسماندگی پر ان کے وجود میں درد والم کیسے شعلے اٹھتے تھے، جگر میں ملت کی بے بسی و بے چارگی پر کس طرح درد وکرب کا دھواں اٹھتا تھا ذیل کے اقتباس میں جو اس مکتوب کی تمہید ہے اس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔

الحاج محترم زیدت معالیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی عنایت کا شکریہ کیا ادا کروں حق تعالی ہی جزا عطا کرنے والے ہیں ارادہ تھا کہ آپ کے اس خط کا فوراً جواب تحریر کروں گا؛ لیکن کچھ تاخیر ہوہی گئی کیونکہ آپ کے خط نے زخموں کو کریدا ہے، مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں، جب میں بہت چھوٹا تھا؛ لیکن تمیز وشعور پیدا ہو چلا تھا، جبل پور میں فساد ہوا تھا گاؤں میں اس وقت ایک اخبار ''سیاست'' آیا کرتا تھا لوگ وہاں کی تفصیلات سناتے تھے میرا دل اس سے اس درجہ متاثر ہوا تھا کہ کئی دن تک اچھی نیند سے محروم ہو گیا تھا، اس کے بعد علم و عقل کی نگاہوں نے ماضی کے خونیں اور ہولناک فسادات کا بھی مشاہدہ کیا اور جو فسادات سامنے گذرتے رہے انھیں بھی آنکھوں سے دیکھنا پڑتا، جب کہیں خونریزی اور درندگی کا ننگا ناچ ہوتا ہے میرا دل تڑپنے لگتا ہے جلوتوں میں ہنستا بولتا اور مسکراتا ہوں؛ لیکن خلوتیں بڑی کربناک اور تکلیف دہ ہو جاتی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام زخم میرے ہی دل و جگر پر لگ رہے ہیں، روتا ہوں، کراہتا

ہوں، آنسو بہاتا ہوں، تڑپتا ہوں، کڑھتا ہوں، خدا کو لپٹتا ہوں؛ لیکن تسکین وتسلی نہیں ہوتی آپ نے فسادات کے متعلق اور مظلومین کے بارے میں دعاء کا حکم دیا ہے، میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے سینے میں کتنا دھواں اور آنکھوں سے کتنا پانی نکلا ہے، جن کے اسلاف نے عرصۂ دراز تک اسی ملک میں شان وشوکت کے ساتھ حکمرانی کی، آج ان کے اخلاف کی حالت یہ ہے کہ اپنی حفاظت سے بھی بے بس اور مجبور ہیں، جو درندے منھ کھول کر ہماری ہڈیاں نوچتے ہیں، ہماری پونجی لوٹتے کھسوٹتے ہیں، جن مونہوں کو ہمارے خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے، جن کا پیٹ صرف ہمارے بدن کی بوٹیوں سے بھرتا ہے، جب وہی درندے اچھی طرح ہماری ہڈیاں توڑ چکتے ہیں، ہماری کھالیں ادھیڑ لیتے ہیں، اور شکم بھر کر ڈکاریں لینے کی تیاریاں کرنے لگتے ہیں تو ہم اپنی عرضیاں اپنی درخواستیں لے لے کر ان کے پاس دوڑتے ہیں اور پھر وہ فریبانہ ہمارے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور جلے ہوئے کو بجھانے کے لئے ہاتھوں میں دوا اور پانی لے کر آتے ہیں اور ہم پر احسان کرتے ہیں، کتنا دردناک منظر ہے۔ (حدیث دوستاں)

ملت اسلامیہ کے ارتقاء وتنزل سے متعلق اس قدر پاکیزہ اور بلند جذبات واحساسات نہ ہر قلب کا مقدر ہیں نہ ہی ہر وجود کا حصہ، جہاں یہ کیفیت ہوتی ہے جذبات کی موجیں ہوتی ہیں وہاں اظہار کی قوت سے محرومی ہوتی ہے، اور جہاں قوت بیان کا اثاثہ پایا جاتا ہے وہاں اس طرح کے قیمتی جذبات نہیں ملتے، ان دونوں اثاثوں کا جب اجتماع ہوتا ہے تو تحریریں ذہن ودل پر اثرات کے حوالے سے سحر انگیز اور دوام آشنا ہو جاتی ہے مذکورہ اقتباس کو پڑھنے کے بعد میرے اس خیال کی یقیناً تائید ہوگی اور قارئین اس اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ سوز جگر اور خون دل سے لکھی ہوئی یہ تحریر کربناک ماحول اور حالات کی بے رحم موجوں میں ڈوبتی ہوئی کشتی حیات کے لئے ساحلوں کی سمت کا نمایاں نشان ہے۔

وقت کے صحرا میں بھٹکے ہوئے مسافروں کی صحیح رہنمائی کی ایک روشن مشعل ہے دلوں میں ایمان ویقین کا چراغ روشن کرنے والی اور زندگی کے دشت میں پھیلی ہوئی تاریکیوں کو چاک کر کے راہ حق کو نمایاں کرنے والی شعاع خورشید ہے۔

وہیں یہ مکتوب زبان وبیان میں لطافت وپاکیزگی اور اس کے حسن وجمال سے قلب وروح کو مرصع کرنے والوں کے لیے شعور ادب کے مراحل میں سنگ میل بھی ہے، اور فلسفہ حیات کے حقائق ومعارف کی مؤثر ودلنشیں تشریحات کے حوالے سے حسن معانی کا اعجاز بھی۔

# فرائض وواجبات پر عمل اور گناہوں سے اجتناب

مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی بنگلور

9611021347

شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو یہ نہ جانتا ہو کہ: انسان کی دنیوی کامیابی، صلاح وفلاح اوراخروی نجات وکامرانی کا راز اللہ اور رسول کی ماننے، ان کے احکام کو بجالانے اور ہر قسم کی معصیت اور گناہوں سے دوری اختیار کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اور یہ بات ہر اعتبار سے درست اور پوری امت کے نزدیک تسلیم شدہ ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اللہ ورسول کی اطاعت وفرماں برداری کرے، اور گناہ ومعصیت سے کلی طور پر پرہیز کرے۔

آج کے پرفتن دور میں ہمیں اس نسخہء کیمیا کی سب سے زیادہ ضرورت ہے؟ کیوں کہ فتنوں میں مبتلا وہی شخص ہوتا ہے جو اللہ کی حفاظت میں نہ ہو، اور اللہ کی حفاظت اطاعت اختیار کرنے اور معصیت سے پرہیز کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

لوگوں کے حالات کا جائزہ لینے سے یہ بات کثرت سے دیکھنے میں آرہی ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ طاعات سے بیزار، اعمال سے دور، معاصی اور گناہوں میں لت پت ہے، جب کہ ایک طبقہ اس کے برعکس ہے۔ یہ لوگ طاعت ونیکی کے اہتمام کے ساتھ برائیوں اور گناہوں سے بچنے کا بھی اہتمام کرتے ہیں، مگر ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ جو طاعت ونیکی کا تو پورا اہتمام کرتا ہے اور نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وعمرہ اور تلاوت وذکر کی پابندی کرتا ہے مگر معاصی وگناہوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ بہت غفلت کا شکار ہے، کیوں کہ گناہوں میں ابتلا رفتہ رفتہ طاعت سے بھی محروم کردیتا ہے۔

### معصیت میں ابتلا طاعت میں غفلت سے زیادہ برا ہے

ایک بات ہمیشہ پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ معاصی اور گناہوں میں ابتلاء طاعت میں غفلت وسستی سے زیادہ برا ہے۔ اس لئے نیکیوں کے اختیار کرنے کے ساتھ برائیوں سے بچنے کا اہتمام اس سے زیادہ ہونا چاہیے۔

سلامتی کے برابر کوء چیز نہیں

حبر الامہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ: حضرت! ایک آدمی وہ ہے جو گناہ بھی کم کرتا ہے اور نیکی بھی کم۔ اور دوسرا وہ ہے جو گناہ بھی زیادہ کرتا ہے اور نیکی بھی زیادہ کرتا ہے۔ ان میں سے آپ کے نزدیک کون زیادہ پسندیدہ ہے؟ جواب میں حضرت عبداللہؓ نے فرمایا:

''**لاا عدل بالسلامۃ شیئا** ''میں سلامتی کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتا۔ یعنی گناہ سے بچ کر سلامتی پالینا ایسا عمل ہے جس کے برابر دوسرا عمل نہیں ہے۔ لہذا گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور معاصی سے پرہیز کو ترجیح ہونی چاہیے، خواہ نوافل واذکار میں کمی بیشی ہو جائے۔

اسلاف کا ایک خوبصورت معمول

اسلاف کا معمول تھا کہ جب وہ آپس میں ملتے اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے تو یہ ضرور کہتے ؛ خف اللہ بالنہار ونم باللیل۔ دن میں اللہ سے ڈرتے رہو اور رات میں سو جاؤ۔ یعنی اگر تمہارا دن اللہ کے خوف کے ساتھ گذر جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ گناہوں سے بچنا ہے تو پھر اگر رات کو نوافل واذکار نہ ہوں. تو پھر اس میں کوئی مضایقہ نہیں کوئی ملامت نہیں۔

گناہوں سے بچنا فرض ہے اور یہ بھی عین عبادت ہے

یہ حقیقت ہے کہ جس طرح اوامر واحکامات کو بجالانا حکم خداوندی اور حکم رسول ہے، اسی طرح نواہی اور معاصی سے بچنا بھی حکم خدا ورسول ہے۔ اور جس طرح طاعت اختیار کرنا لازم اور ضروری ہے۔ گناہوں سے بچنا بھی فرض ہے، بلکہ احادیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ گناہوں سے بچنا عین عبادت ہے، اور جس طرح عبادت میں محنت اور مجاہدہ کرنے والے کا مقام ہے، اسی طرح گناہوں اور حرام وناجائزہ کاموں سے بچنے والے کا بھی مقام ہے۔ اسی لئے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اپنے وعظ میں یہ بات کہتے تھے۔ ماعبد العابدون بشئی افضل من ترک مانھٰھم اللہ عنہ۔ عبادت کرنے والوں نے کوئی عبادت اللہ منع کردہ چیزوں سے بچنے وچھوڑنے سے زیادہ بہتر نہیں کی۔

امام ابوعیسی الترمذی کی تخریج کردہ ایک حدیث ہے جس کو انھوں نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ؛ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون ہے جو مجھ سے پانچ باتیں لے اور ان پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی سکھائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے فوراً کہا؛ انا۔ یعنی میں اس کے لئے تیار

ہوں۔اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور وہ پانچ باتیں ارشاد فرمائیں:

**اتق المحارم، تکن اعبدالناس**: حرام کاموں سے بچتے رہنا، لوگوں میں سب سے بڑے عابد بن جاؤ گے۔

**وارض بما قسم اللہ لک، تکن اغنی الناس**: اللہ کی تقسیم پر راضی رہنا لوگوں میں سب سے بڑے مالدار ہو جاؤ گے۔

**واحسن الی جارک تکن مومنا**: پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا مومن بن جاؤ گے۔

**واحب للناس ما تحب لنفسک تکن مسلما.** اپنے لئے جو پسند کرتے ہو . وہی دوسروں کے لئے پسند کرو تو مومن بن جاؤ گے۔

**ولا تکثر الضحک فان کثرۃ الضحک تمیت القلب**: اور زیادہ نہ ہنسنا، کیوں کہ زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔

یہ حدیث صاف بتا رہی کہ گناہ کا چھوڑنا انسان کو سب سے بڑا عابد بنا دیتا ہے۔

ایک مشتبہ درہم کا چھوڑنا چھ لاکھ درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے خصوصی شاگرد حضرت امام عبداللہ ابن المبارک نے ایک موقعہ پر یہ بات ارشاد فرمائی کہ: ''میں ایک مشتبہ درہم چھوڑ دوں یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ایک لاکھ کا صدقہ دوں'' اس طرح کہتے کہتے انہوں نے چھ لاکھ تک شمار کیا۔(جامع العلوم والحکم:۹۶)

خلیفہء راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول

امیر المؤمنین حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: میں چاہتا ہوں کہ فرض و وتر کے علاوہ کوئی نفل نہ پڑھوں۔زکوٰۃ کے سوا کوئی صدقہ نہ دوں، بجز رمضان کے روزوں کے دوسرے روزے نہ رکھوں اور حج فرض کے علاوہ کوئی نفلی حج نہ کروں۔پھر میں اپنی ساری توانائی اور قوت و طاقت کو اللہ کی حرام کردہ چیزوں اور معاصی سے بچنے میں لگا دوں۔(ایضا:۹۶)

مذکورہ تفصیل یہ بتاتی ہے کہ آدمی کو گناہ سے بچنے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔فرائض و واجبات پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کے ساتھ اپنی تمام تر توانائی اور طاقت گناہوں سے بچنے میں لگا دے تو یہ بات اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے۔بہ نسبت اس کے کہ وہ نوافل و اذکار کی تو بہت پابندی کرے اور گناہ نہ چھوڑے۔اللہ ہم سب کو کامل ایمان اور کامل تقوی نصیب فرمائے آمین۔

# دکن میں اردو کا ارتقا۔ایک تاریخی جائزہ

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

دکن کا علاقہ، اردو زبان کے ابتدائی گہواروں میں شمار ہوتا ہے۔ گو کہ اردو کی جائے پیدائش کی بابت اہل رائے کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہیں، کسی نے اسے پنجاب کہا، تو دوسرے نے سندھ سے اس کا رشتہ جوڑا، کبھی گنگ وجمن کے دوآبہ میں اسے تلاش کیا گیا تو کبھی اسی دکن کے علاقہ میں اس کے نقوش ڈھونڈے گئے۔ لیکن اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں کہ دکن کی گلیاروں میں اردو کا بچپن اور لڑکپن گذرا ہے، اور اس کے دور طفلی کی یادوں کو یہاں کے بام ودر نے محفوظ کیا ہے۔ اس کی نوخیز جوانی اور امنڈتے جذبات کو یہاں اظہار کا پیرایہ ملا ہے، اور اس کے خیالات اور امنگوں کو یہاں بال وپر نصیب ہوئے ہیں۔ شمال کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس کی گرم فضاؤں میں اردو کی نشو ونما بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہوئی، اور اس سرعت کے ساتھ اس نے وہاں جوانی اور پختگی کے مراحل طے گئے کہ اس کے بچپن کے نقوش کی تلاش مشکل ہوگئی۔ لیکن دکن کے علاقہ میں جو اردو اپنے بچپن میں 'ہندی' اور 'دکھنی' کے نام سے پکاری جارہی تھی، اس کے بچپن کی معصومیت بھری ادائیں یہاں سات صدیوں کی طویل مدت کے بعد بھی باقی رہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دکن میں آج کی زبان اردو؛ اپنی دکنی شناخت کی لفظیات اور طرز اظہار میں ابتدائی ہندی اور دکھنی کے ساتھ رشتہ برقرار رکھے ہوئی ہے۔

اہل زبان کہتے ہیں کے خلجی دور میں علاء الدین اور ملک کافور کی فتوحات نے اسلام کے اثرات دکن کے جنوب میں دور تک پھیلا دئے تھے؛ جبکہ اس سے قبل بھی اس علاقہ میں صوفیا کرام سکونت اختیار کر چکے تھے اور مصروف تبلیغ تھے؛ جن میں سید شاہ مومن (متوفی 597)، شاہ جلال الدین گنج رواں (متوفی 644)، بابا شرف الدین (متوفی 687) اور بابا فخر الدین (متوفی 694) وغیرہ شامل ہیں، لیکن محمد تغلق نے جب دیوگڑھ کو دولت آباد کے نام سے پایہ تخت بنا کر دہلی کی آبادی وہاں منتقل کی تو بڑی تعداد میں مختلف میدان زندگی کے ماہرین اور اہل کمال یہاں آئے۔ چونکہ شمال میں اردو اپنی ابتدائی شکلوں میں استعمال ہورہی تھی؛ جس کی یادگار امیر خسرو کی ہندوی آج بھی موجود

ہے' شمال کے ان نو واردین نے دکن کے دیسی لوگوں کے ساتھ اسی زبان کا استعمال کیا، اور دکن میں وہ 'دکھنی' کا نام پانے لگی۔ اسی زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے دکن کے ساحلی علاقوں کا سفر کیا اور یہاں کے مختلف شہروں میں کثرت سے مسلمانوں کی آبادیاں، مسجدیں اور تعلیم گاہیں دیکھیں اور ان کے اثرات محسوس کئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسی زمانے میں جب دکن میں باضابطہ پہلی آزاد مسلم حکومت 'بہمنی سلطنت' (747-900/1347-1495) کے نام سے قائم ہوئی تو اسی سلطنت کے ایک نامور اور فاضل بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دہلی سے معروف چشتی بزرگ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ اجل حضرت سید محمد حسینی معروف بہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز 815ھ میں بہمنی دار الخلافہ گلبرگہ میں قیام پذیر ہوئے۔ شمال کی بہ نسبت دکن کو یہ تاریخی تفوق حاصل ہے کی اردو کی پہلی نثری تصنیف اسی عہد میں لکھی گئی، چنانچہ مولوی عبد الحق کے مطابق حضرت خواجہ بندہ نواز (825ھ) نے 'معراج العاشقین' مرتب فرمائی جسے اردو کا اولین نثری سرمایہ کہا جاتا ہے۔ بعد کی تحقیقات میں بعض محققین نے اس رسالے کو خواجہ گیسو دراز کے بجائے ان سے کافی بعد کی شخصیت مخدوم شاہ حسینی کا قرار دیا ہے، ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اس موضوع پر اپنی تحقیق کا یہی نتیجہ پیش کیا ہے۔ بہمنی دور کے ان صوفیا نے عوام کے درمیان تبلیغ واصلاح کے لئے 'ہندی' زبان کو استعمال کیا، اسی طرح اس دور کے شعرا نے بھی اس زبان کو اظہار خیال کا پیرایہ عطا کیا۔ ان میں خواجہ گیسو دراز، سید اکبر حسینی، نظامی، شاہ صدر الدین، شاہ میرا جی شمس العشاق، لطفی اور آذری وغیرہ مشہور ہیں۔

قطب شاہی دور جو 1495 تا 1690 کے عرصہ تک دراز ہے' اردو کے گیسو کو سنوارنے اور سجانے کے لئے معروف ہے۔ اس حکومت کے سلاطین نے نہ صرف اردو کے باکمالوں کی قدر افزائی کی، بلکہ ان میں متعدد حکمراں خود بھی صاحب سیف سے زیادہ صاحب قلم کے طور پر مشہور ہوئے۔ بانی سلطنت سلطان قلی قطب شاہ کی شعر و ادب سے دلچسپی کی وجہ سے ایسا ماحول تیار ہوا کہ اس کا جانشین سلطان جمشید قلی فارسی کے شاعر کے طور پر سامنے آیا۔ ابراہیم قلی کا بیس سالہ دور حکومت 'دکھنی' زبان کی ترقی کیلئے بہت زرخیز رہا۔ اسی کے فرزند سلطان محمد قلی قطب شاہ ہیں جو دکن میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز اپنے نام رکھتے ہیں۔ پھر سلطان محمد قطب شاہ نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شاعری کی۔ اس کے فرزند عبد اللہ قطب شاہ کا دور قدیم اردو یا دکھنی کے عروج کے لئے کافی سازگار

رہا ہے۔قطب شاہی دور کے ان سلاطین کے زمانے میں اردو کے معروف شعراء اور نثر نگاروں نے اس زبان کو سنوارا۔ ان میں ملا وجہی ،غواصی ،قطبی ،ابن نشاطی،جنیدی ، مرزا محمد امین ،ملا محمد شریف طبعی ،اولیا،اور غلام علی وغیرہ نے ناموری حاصل کی ۔ان کے علاوہ میرا جی حسن خدانما،مولانا عبداللہ، میراں یعقوب،اور عابد شاہ وغیرہ کی نثری تحریروں نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

دکن کی عادل شاہی حکومت (895-1097) کے سلاطین کی دل چسپی اور قدرافزائی بھی اردوئے قدیم یا دکھنی کے عروج وارتقاء میں حصہ دار رہی ہے۔ بانی حکومت یوسف عادل شاہ کو شعر وسخن سے دلچسپی تھی ،اسکی اکیس برس کی حکومت کے بعد اس کے فرزند اسماعیل عادل شاہ نے پچیس برس حکومت کی ، وہ شاعر تھا اور شاعروں کا قدر داں۔ ابراہیم عادل شاہ کے زمانے میں نہ صرف دکنیوں کو عروج حاصل ہوا' بلکہ کہا جاتا ہے کہ قدیم اردو یعنی دکھنی اردو کو ہی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا تھا۔اس سے زبان کو کافی فروغ ملا، اور تصنیف وتالیف کی طرف رجحان میں اضافہ ہوا۔ علی عادل شاہ کی بتیس برس کی حکمرانی بھی اصحاب علم وفضل کی قدردانی میں پیش پیش رہی ہے۔ابراہیم عادل شاہ دوم کا دور اردو کیلئے زریں ہے،تاریخ فرشتہ اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کے بعد محمد عادل شاہ کا تیس سالہ دور اور پھر علی عادل شاہ دوم کا سولہ سالہ زمانہ حکومت بھی اردو کو ترقی کے زینے طے کراتا رہا۔گو کہ یہ زمانہ سیاسی لحاظ سے انتشار بلکہ زوال کا ہے،لیکن اس دور میں بھی علم وادب کے چمن میں اسی طرح بہا قائم رہی ہے۔ عادل شاہی دور کے اہل علم ،صوفیا، ادبا اور شعرا نے اردو زبان میں اظہار خیال کیا اور کتابیں لکھیں۔شاہ برہان الدین جانم نے دکھنی زبان میں کئی رسالے لکھے۔ عبدل، مقیمی ،محمد ابراہیم صنعتی اور کمال خان رستمی وغیرہ مشہور شعرا نے اردو میں شاعری کی۔

دکن میں احمد نگر کی نظام شاہی حکومت بھی دکھنی یا اردو کی خدمت اور قدردانی میں پیچھے نہیں رہی ہے۔ یہ زمانہ مجموعی طور پر دکن میں اردو تصنیف وتالیف کا رہا ہے۔ بول چال سے لے کر اصلاح وتبلیغ تک اور ادبی وشعری سرمایہ کیلئے اردو کا استعمال کثرت سے ہونے لگا تھا۔ بانی سلطنت احمد نظام شاہ خود بھی بہترین اوصاف سے آراستہ تھا۔اس کے فرزند برہان نظام شاہ کے طویل دور میں علم وفن کی بڑی ترویج وترقی ہوئی۔اس کے عہد میں کئی بڑے علماء ایران سے یہاں آ گئے تھے،اور احمد نگر علم وفن کا مرکز بن گیا تھا۔ حسین نظام شاہ بھی علم دوست اور ذی علم حکمراں تھا۔ بعد کا زمانہ گو کہ سیاسی طور پر کافی انتشار اور اتھل پتھل کا زمانہ رہا ہے، جس کی وجہ سے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی طرح

شعر وسخن کی گرم بازاری قائم نہ ہوسکی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دکنی زبان کی ترقی میں احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے بھی حصہ لیا ہے۔ اس دور کے شعراء میں آفتابی اور شوقی کے نام معروف ہیں۔

اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ گول کنڈہ، بیجا پور اور احمد نگر علم وفضل کے روشن مراکز بنے ہوئے تھے، اور عربی وفارسی کے علاوہ دکھنی یا قدیم اردو میں تصنیف اور شاعری کے بہترین سرمایے وجود میں آرہے تھے۔ اردو کے ارتقا میں یہ خدمات ہمیشہ قابل قدر رہیں گے۔

اس دور سے ہم آگے بڑھتے ہیں تو ہماری ملاقات ایک معروف شاعر ولی دکنی (1119ھ) سے ہوتی ہے۔ کچھ نے اسے گجرات کا شاعر بتایا ہے، لیکن محققین کو اس کے دکنی ہونے پر اصرار ہے۔ ولی دکنی نہ صرف دکن کے لئے بلکہ شمال کے لئے بھی اردو شاعری بالخصوص غزل کے ایک نمائندہ شاعر سمجھے جاتے ہیں، ان کے ذریعہ اردو شاعری مثنوی سے غزل کی طرف مڑتی ہے، اور اردو شاعری میں سلاست وروانی، سادگی اور صفائی کا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی ولی اورنگ آبادی نے اپنے سفر دہلی کے بعد اردو کے لئے ریختہ کا لفظ استعمال کیا:

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دے رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

گو کہ شمال میں اس لفظ کا استعمال رائج تھا، میر صاحب فرماتے ہیں:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

عالمگیر کے بعد مغل حکومت کی زبوں حالی نے دکن میں نواب قمر الدین نظام الملک آصف جاہ کے لئے علاقائی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کردی، جو فرخ سیر کے عہد میں دکن کے صوبہ دار ہوئے، پھر محمد شاہ کے زمانہ میں سنبھل اور مراد آباد کے بعد مالوہ کی صوبہ داری سے ہوتے ہوئے مرکز کے قلمدان وزارت پر سرفراز ہوئے۔ لیکن نادر شاہی حملہ کے بعد مرکز کے دگرگوں حالات کے پیش نظر دکن واپس آکر یہاں آصف جاہی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس موقع پر بہت سارے اہل کمال نے دکن کا رخ کیا۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مصنف سبحۃ المرجان اسی زمانہ میں اورنگ آباد تشریف لائے جو آصف جاہی حکومت کا مرکز تھا۔ اس نئی حکومت کے تحت نظم ونثر کی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں، اور بالخصوص دکھنی شعراء کے تذکرے لکھے گئے، جیسے خواجہ حمید کی 'گلشن گفتار'، خواجہ عنایت اللہ کی 'ریاض حسنی'، لالہ لچھمن نرائن شفیق کا 'چمنستان شعراء' وغیرہ۔ وزیر اعظم ارسطو جاہ نے دوسو سے زیادہ شعراء کی سرپرستی کرکے اردو زبان کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔ شمس الامراء مہاراجہ چندو لال کی

خدمات بھی قابل قدر رہی ہیں۔ سراج اورنگ آبادی جیسے ناموراور پر گوشاعراسی دور کی یادگار ہیں جنھوں نے اردو کو بام عروج پر پہنچایا، ان کا کلام ہے:

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی ☆ نہ تو توں رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

ان کے علاوہ کئی نامور شعراء، ادباء اور مصنفین نے اردو کے گیسو سنوارنے میں حصہ لیا ہے۔

نواب ناصر جنگ، نواب مظفر جنگ اور نواب صلابت جنگ کے بعد آصف جاہ ثانی نواب نظام علی خاں کے زمانہ میں اس حکومت کا مرکز اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہو گیا۔

نواب سکند جاہ آصف جاہ ثالث، پھر نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع اور نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس کا زمانہ اردو کے کارواں کو تیزی سے آگے بڑھاتا رہا۔ دہلی جو اب اجڑ چکی تھی، وہاں کے باکمالوں کا مرکز بھی اب دکن ہی تھا۔ شیخ حفیظ دہلوی، شاہ کمال اور مشتاق دہلوی نے یہاں آکر اردو کی خدمت انجام دی۔ اس دور میں امیر کبیر شمس الامراء ثانی محمد فخر الدین خاں تیغ جنگ نے سائنسی کتابوں کے اردو تراجم سے دلچسپی لی۔ 1242ھ میں انھوں نے اس کام کی داغ بیل ڈالتے ہوئے ترجمہ کا آغاز کرایا، انھوں نے مغربی زبانوں سے سائنس کی تقریبا 75 کتابوں کا ترجمہ کرایا، یہ بڑا تاریخ ساز قدم تھا جس نے اردو زبان کو بہت مالا مال کیا۔ اور ساتھ ہی مختلف علوم و فنون کی کتابیں کثرت سے اردو میں تصنیف کی جانے لگیں۔ آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں اور آصف جاہ سابع سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں کا زمانہ دکن میں اردو زبان و ادب کا عنفوان شباب اور معیاری ارتقاء کا دور رہے۔ اس دور کے آغاز میں ایک انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے سرکار آصفیہ کے دفاتر کی زبان فارسی کے بجائے مکمل طور پر اردو قرار دے دی گئی، جس کے نتیجہ میں اردو کا رواج بہت بڑھ گیا۔ اس عہد میں ملک کے نامور اہل کمال دکن آئے، اور یہاں شاہانہ سرپرستی میں اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی۔ ان میں داغ دہلوی، امیر رامپوری، نواب محسن الملک، مولوی میر مہدی علی، نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین، مولوی چراغ علی، مولانا نذیر احمد، پنڈٹ رتن ناتھ سرشار، مولوی عبد الحلیم شرر، مولوی سید علی بلگرامی، مولوی سید حسین بلگرامی، علامہ شبلی نعمانی اور مولوی ظفر علی خاں آسمان علم و ادب کے تابناک ستارے ہیں، جنھوں نے حیدرآباد دکن میں ایک عرصہ گذار کر تصنیف و تالیف کے میدان میں گراں بہا خدمات انجام دیں۔ آخری دور کے باکمال شاعروں میں ایک نام احمد حسین امجد حیدرآبادی کا ہے جنھوں نے نہایت سادہ اور مؤثر انداز میں پاکیزہ شاعری کی ہے۔ ان کے علاوہ مشہور شعراء، ادباء اور علماء و مصنفین میں راجہ کشن پرشاد، غلام علی

حیدر طباطبائی، فضیلت جنگ خان بہادر مولانا انوار اللہ خاں، حکیم سید شمس اللہ قادری، مانک راؤ وٹھل راؤ، مرزا فرحت اللہ بیگ، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر سید محی الدین زور، سید عبد القادر سروری، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر ولی الدین، عبد الحمید صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر ہارون خاں شروانی، مولانا عبد اللہ عمادی، محمد الیاس برنی، ڈاکٹر یوسف الدین، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جہاں بانو بیگم اور زینت ساجدہ وغیرہ چند معروف نام ہیں۔

دکن میں اردو کے ارتقاء میں حکومت کی سرپرستی اور انفرادی خدمات کے ساتھ ساتھ ان اداروں اور انجمنوں کا بھی بہت بڑا کردار رہا ہے جنھوں نے تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سرفہرست عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے جسے آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں نے 1918 میں قائم کیا تھا، اور اس میں ذریعہ تعلیم اردو رکھا گیا تھا۔ اسی طرح نواب میر عثمان علی خاں کے ذریعہ قائم کئے گئے 'دار الترجمہ' کی خدمات نہایت عظیم الشان ہیں، جس نے ان تمام مضامین پر کتابوں کے تراجم کرائے جن کی تعلیم اس وقت عثمانیہ میں دی جارہی تھی، اور یوں سینکڑوں کتابوں کے تراجم انجام پائے۔ ادارہ ادبیات اردو کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے جو ایک طویل عرصہ سے اردو زبان او ادب کے ارتقاء میں اپنا گراں قدر حصہ ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح انجمن ترقی اردو، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اردو اکیڈمی اور دیگر اداروں نے بھی ناقابل فراموش خدمات انجام دئے ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ دینی اور عربی مدارس نے اردو کی خدمت جس ذوق و شوق اور بلندی و پختگی کے ساتھ انجام دی ہیں وہ صرف ان کا حصہ ہیں۔

دکن میں اردو کے آغاز سے لے کر عہد بہ عہد ارتقاء سے گذرتے ہوئے موجودہ زمانہ تک جس طرح مختلف حکومتوں، افراد و شخصیات اور اداروں نے گیسوئے اردو کو سنوارا ہے' اس کا نتیجہ ہے کہ آج دکن میں اردو اپنی مضبوط جڑوں پر کھڑی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اردو نے یہاں بھی ناسازگاری حالات کے سخت تھپیرے سہے ہیں، اور اس کی چمن میں مخالفتوں کی آندھیاں آئی ہیں، لیکن اردو کے خدمت کنندگان کے خلوص اور جد و جہد کا خوشگوار نتیجہ ہے کہ اردو زبان اپنی آن و شان کے ساتھ نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کے وجود پر بہار پر ایک بہترین تاج کا اضافہ ابھی حال میں یوں ہوا کہ اسی دکن کے شہر حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں ملک کی اولین مرکزی یونیورسٹی اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ قائم ہوئی ہے جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام سے معروف ہے۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے طرز پر ہی یہ یونیورسٹی جدید مضامین کی تعلیم اردو ذریعہ سے دے رہی ہے۔

# جگر۔۔۔چند یادیں

## تیرا ہی تو عالم ہے تری یاد کا عالم

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ

دن اور تاریخ تو اب یاد نہیں البتہ ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء کی ایک خنک رات کو چاند اینگلو اردو ہائی اسکول احمد نگر کے ہم چند طلباء ایک مشاعرے میں شریک ہوئے مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے صدر بزم نے ''احمد نگر کالج'' کے ایک خوش گلو نوجوان کا نام لیتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ شہنشاہ تغزل حضرت جگر مرادآبادی کی ایک غزل سنائیں گے۔

دلکش ترنم کے ساتھ جگر کی غزل شروع ہوئی فضا میں ایک کیف طاری تھا، ہر چیز ساکن اور مسحور تھی۔ پڑھنے والا آنکھیں بند کئے ترنم ریز تھا۔

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے — یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے
جنوں کے دم سے ہے نظم دو عالم — جنوں برہم زن افکار بھی ہے
قفس پر ہے مدار زندگانی — نفس چلتی ہوئی تلوار بھی ہے
یہی دنیا ہے بستی آنسوؤں کی — یہی دنیا تبسم زار بھی ہے
خبردار اے سبک ساران ساحل — یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے
جو کوئی سن سکے تو نکہت گل — شکست رنگ کی جھنکار بھی ہے

تیرہ چودہ سال کی عمر میں سنے ہوئے ان اشعار کا مفہوم تو کیا سمجھتا؛ البتہ زندگی میں پہلی بار کانوں میں پڑے ہوئے جگر کے ان اشعار کو بے تکلف دوستوں کی مجلس میں اتنا گنگنایا گیا کہ وہ لوح ذہن پر آج تک مرتسم ہیں۔

۱۹۵۰ء میں ڈی۔ بی مسعود پونوی (ریڈیوں سنگر) سے ایک شادی کے موقع پر جگر کی دوسری غزل سنی، ساز کے آہنگ کے ساتھ مسعود کی دلکش نغمہ سنجی اور پھر جگر کے یہ اشعار:

جو جہنم میں بھی فردوس بداماں ہوں گے — دیکھ لینا وہ ہمیں سوختہ ساماں ہوں گے

نہیں معلوم وہ کس وضع کے انساں ہوں گے جن پہ تیرے ستم خاص کے احساں ہوں گے

جمع سب حسن کے اجزائے پریشاں ہوں گے ہم تو ہم بت بھی کسی روز مسلماں ہوں گے

نغمہ بربط غم، کیف اثر، شورش جاں انہیں پردوں سے کسی دن وہ نمایاں ہوں گے

لطف آزادیٔ زنداں بلا کیا کہئے جب جو چھوٹے تو اسیر غم زنداں ہوں گے

تجھ کو گلشن کی قسم چھیڑ نہ اے باد سحر کھل گئیں غنچوں کی آنکھیں تو پریشاں ہوں گے

شعلہ سامانی غم پر نہ کرو ناز جگر تم سے کتنے ہی جگر شعلہ بداماں ہوں گے

غزل ختم ہوئی سامعین کے اصرار پر مسعود صاحب اس غزل کو دوبارہ سنانے پر مجبور ہوئے، مگر میری سیری اب بھی نہیں ہوئی تھی، اور جی یہ چاہ رہا تھا کہ کاش پوری رات کلام جگر سنتے ہوئے گذر جائے۔

کاش یہ سلسلہ اتنا طویل ہو کہ زمان و مکان کی گردش اسی پر ختم ہو جائے، غرضیکہ حکیم مشرق علامہ اقبال کے بعد شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی سے میری عقیدت کا سلسلہ عنفوان شباب ہی سے شروع ہو گیا۔

۱۹۵۵ء میں ندوہ میں داخلہ لینے کے بعد انجمن ''الاصلاح کے دارالکتب سے ''شعلۂ طور'' حاصل کی اور اس کے ہر شعر کو ترنم سے پڑھ کر لطف اندوز ہوتا رہا، خوش قسمتی سے جگر صاحب کی زیارت بھی یہیں ہوئی، یہ بھی ایک دلچسپ اور تاریخی واقعہ ہے، غالباً ۱۹۵۷ء میں لکھنؤ ریڈیو کے ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں جگر صاحب لکھنؤ تشریف لائے، شبلی ہاسٹل کے ادبی ذوق کے حامل طلبہ اور خاص طور پر جگر کے پرستاروں کے لئے یہ خبر مژدہ جانفزا تھی، طلباء ندوہ کی یونین الاصلاح کے عہدہ داروں نے طے کیا کہ جگر صاحب کو ندوہ آنے کی دعوت دی جائے؛ مگر اس پروگرام کے عمل میں آنے کے امکانات بظاہر معدوم تھے، کیوں کہ جگر صاحب کی جان لیوا بیماری کا سلسلہ شروع تھا اور ڈاکٹروں نے ان کو احتیاط کی سخت ہدایت کی تھی، مگر ہمارے شوق نے ہمیں مایوس نہیں ہونے دیا، جگر صاحب کو مدعو کرنے کے لئے صدر الاصلاح مولانا ابوالعرفان صاحب سے اجازت کے لئے ہم حاضر ہوئے؛ مگر چونکہ یہ عین سالانہ امتحانات کے دن تھے، اس لئے موصوف نے عمومی جلسے کی تو اجازت نہیں دی؛ البتہ مہمان خانہ میں ایک مخصوص نشست کے انعقاد کا مشورہ دیا اور صرف اونچے درجات کے چند طلباء کو اس میں شرکت کی اجازت دی، استاذ گرامی مولانا محمد اویس ندوی نے صبح کی چائے کا انتظام

اپنے ذمہ لیا اور الاصلاح کا وفد خوش خوش جگر صاحب کو صبح ۸ بجے ندوے میں مدعو کرنے کے لئے روانہ ہوا، اس موقع پر مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی نے جو پر لطف جملہ فرمایا تھا وہ مجھے اب بھی یاد ہے، موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: کہ دیکھو بھائی! جگر صاحب سے کہنا کہ ندوے میں آٹھ، آٹھ ہی بجے بجتے ہیں، یہ نہ ہو کہ آپ انہیں آٹھ بجے مدعو کریں اور وہ دس بجے تشریف لائیں، اس جملہ کا لطف وہی شخص لے سکتا ہے جس نے مولانا ابوالعرفان صاحب کو دیکھا ہو، اور ان کی گفتگو سنی ہو، اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کے لب ولہجہ کا اتار چڑھاؤ اور جسم کی حرکت آج تک یاد ہے۔

انجمن الاصلاح کا وفد جگر صاحب کی قیام گاہ پہونچا، جب انہیں اطلاع ملی کہ ندوہ کے چند طلباء ملنا چاہتے ہیں، تو موصوف نے فوراً اذن باریابی دیا اور خندہ پیشانی سے طلبہ کی دعوت قبول کی۔ دوسرے دن صبح صدیق حسن صاحب مرحوم اور حبیب احمد صدیقی کے ہمراہ جگر صاحب دارالعلوم تشریف لائے۔

جگر صاحب کا سراپا ان کے اس شعر کے مصداق تھا:

ہر طرف غل ہے وہ آیا جگر بادہ پرست
اثر نشۂ صہباء سے سراپا بد مست

مخمور آنکھیں، پریشان زلفیں، ظاہری آرائش سے بے نیاز لباس اور چال ڈھال ایسی کہ گویا:

ع۔ ہاتھ پڑتے ہیں کہیں پاؤ کہیں پڑتا ہے

گو کہ جگر کا یہ دور رندی نہ تھا؛ مگر ماضی کے اثرات ایسے پختہ تھے کہ گویا ابھی ابھی میخانے سے چلے آرہے ہو۔

ناشتہ کے بعد شعر وسخن کی محفل جمی ابتداء میں صدیق حسن صاحب مرحوم اور حبیب احمد صدیق صاحب نے اپنا کلام اور پھر جگر صاحب نے اپنے پرسوز ترنم میں یہ غزل پڑھی۔

صد آرزوئے خوشگوار وسرگراں لئے ہوئے پھرا کرے گی زندگی کہاں کہاں لئے ہوئے
ہوا نہ دل ہی ملتفت اگر چہ مدتوں کے بعد شمیم دوست آئی تھی قرار جاں لئے ہوئے
خوشا حیات عاشقاں کہ موت جب بھی آئی ہے تو ساتھ ایک حلقۂ پری وشاں لئے ہوئے
ترس رہی ہے زندگی برس رہی ہے زندگی نفس نفس میں تشنگی کی داستاں لئے ہوئے
اب اس مقام عشق سے گذر رہا ہوں میں جگر کہ ظلمتیں بھی ہیں جہاں تجلیاں لئے ہوئے

سماع مع مزامیر کے جواز وعدم جواز سے قطع نظر جی چاہ رہا تھا کہہ دوں۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

یہ پر لطف اور یادگار مجلس دو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہی، واپسی سے پہلے جگر صاحب نے ''زیر تعمیر رواق رحمانی'' کا معائنہ کیا اور باصرار پچاس روپے اپنی طرف سے پیش کئے، جگر صاحب کی شرافت نفس، انسان دوستی اور اسلام پسندی کے بے شمار واقعات سنے تھے؛ مگر دین اور طلباء علوم دین سے ان کی محبت کا عینی مشاہدہ کرکے ان کی عظمت دل میں کئی گنا بڑھ گئی۔

رات کو ریڈیو پر مشاعرہ تھا شبلی ہوسٹل کے جمالیہ ہال میں ریڈیو کے گرد مشاعرہ سننے والوں کی ایک بھیڑ جمع تھی، جب جگر صاحب کی باری آئی تو قلم کاغذ پر تیزی سے چلنے لگے، اکثر طلباء نے ان کے کلام کو نقل کیا۔

جگر صاحب دلسوز لے مگر تھکے ہوئے لہجے میں پڑھ رہے تھے،

غم میں بھی جسکو اک سرور نہیں　　　زندگی کا اسے شعور نہیں
دل ہی وہ کیا جو ناصبور نہیں　　　تو نہ شرما ترا قصور نہیں
مجھ کو شکوہ ہے چشم ساقی سے　　　پی رہا ہوں مگر سرور نہیں
میں ہوں اور دشت غم کا سناٹا　　　کوئی آواز دور دور نہیں
لالہ وگل بھی اجڑے اجڑے سے　　　شب ماہتاب میں بھی نور نہیں
زندگی ہے ترے فراق کا نام　　　تو مگر زندگی سے دور نہیں
کل دکھائے گا کیا بہار کو منہ　　　دل جو زخموں سے آج چور نہیں

سامعین کے اصرار پر انہوں نے دوسری غزل سنائی۔

لب ترستے ہیں التجا کے لئے　　　ہاتھ اٹھتے نہیں دعا کے لئے
ہم نے تنہائیوں میں کیا کیا لطف　　　ایک آواز بے صدا کے لئے
ہم نے ہر غم کو زندگی بخشی　　　اپنی طبع غم آشنا کے لئے
پھول کو رنگ و رامش و نکہت　　　اور آوارگی صبا کے لئے

لکھنؤ میں جگر صاحب کی زندگی کی یہ آخری ادبی نشست تھی، اس کے چند ہی دنوں بعد وہ اپنے ہزاروں مداحوں کو سوگوار چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

جگر کے ترنم میں ایسا سوز وگداز تھا کہ جوان ہی پر ختم ہو گیا، یہ سوز و گداز انہیں غم عشق کی بدولت حاصل ہوا تھا، غم ان کی غذا بن چکا تھا، بلکہ انہیں کے الفاظ میں جس نے ان کی کائنات کا مقام حاصل کر لیا تھا۔

دل گیا رونق حیات گئی　　　غم گیا ساری کائنات گئی
ہم نے ہر غم کو زندگی بخشی　　　اپنی طبع غم آشنا کے لئے

پروفیسر آل احمد سرور نے خوب لکھا کہ ''عشق کی آگ میں جلنے اور پگھلنے سے جگر کی آواز میں لے اور ان کی شخصیت میں گداز پیدا ہو گیا۔

بعض سطح بیں جگر کی مقبولیت کو ان کے ترنم کا مرہون منت سمجھتے ہیں؛ حالانکہ اس سے بڑھ کر جگر پر کوئی الزام نہیں ہو سکتا۔

جگر صاحب کی سب بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ زندگی کے ہر دور میں مشرقی اور مذہبی اقدار کے وفادار رہے، وہ جب رند بادہ خوار تھے اس وقت بھی مذہب کے احترام کا دامن کسی لمحہ بھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، حتی کہ ان کی مجلس میں بھی کسی کی جرات نہیں تھی کہ وہ دینی معتقدات اور روحانی اقدار کو نشانۂ تضحیک بناتا، جگر صاحب کے خلوت جلوت کے راز داں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

جگر صاحب کا علی گڑھ اور الہٰ باد کا وہ زمانہ یاد ہے جب ہوز یادہ تر مخمور اور بدحال رہتے تھے؛ لیکن دین یا ائمہ دین کے خلاف کوئی فقرہ کان میں پڑ جاتا تو بدمستی کا پورا زور اس پر صرف کر دیتے، جس کی زبان سے وفقرہ نکلا ہوتا۔ مذہب ان کی نہاد میں تھا، جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی اس طرح کرا جاتے کہ بڑی نزاکت کا سامنا ہو جاتا۔

جگر صاحب کی توبہ حقیقی معنوں میں ''توبۃ النصوح'' تھی، انھوں نے اپنے دور رندی کی تلافی کی ہر ممکن کوشش کی، شراب جوان کی زندگی کا جزء بن چکی تھی اور جس کے متعلق خود کہتے ہیں۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

جب سے یک لخت چھوڑ دیا تو صحت متاثر ہونے لگی، ڈاکٹروں نے کہا، اسے بتدریج ترک کریں، ورنہ آپ کی جان کو خطرہ ہے، جواب میں فرمایا: کہ چاہے موت آجائے؛ مگر اسے اب چھو نہیں سکتا۔

ایک اور سبق آموز واقعہ سنئے جس کے راوی استاد گرامی مولانا محمد اویس صاحب ندویؒ ہیں۔

''اپنی طبیعت کی انتہائی ناسازی کے موقع پر جب کہ دل کے مسلسل دورے پڑ رہے تھے جگر صاحب گونڈہ سے لکھنؤ بغرض علاج لائے گئے، ان کا قیام صدیق حسن صاحب مرحوم کے بھائی کے مکان پر تھا، ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے حتی کہ حرکت اور طویل گفتگو تک سے منع کر دیا تھا، ایک دن عصر بعد چند بے تکلف احباب جمع تھے، جگر صاحب نے چاہا کہ کچھ اشعار سنائیں؛ مگر سب نے ان کی صحت کے خیال سے اس وقت انہیں سنانے سے منع کر دیا، تھوڑی دیر میں مغرب کی نماز کا وقت آیا حاضرین مجلس نماز کے لئے کھڑے ہوئے، جگر صاحب تیزی سے چار پائی سے اترے اور وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گئے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب ان سے کہا گیا کہ ڈاکٹروں نے ہلنے، چلنے سے منع کیا ہے، آپ چار پائی ہی پر اشارے سے نماز پڑھ لیتے، تو جواب میں فرمایا کہ: ''مکافات عمل کر رہا ہوں''۔

جگر صاحب شہرت و عزت کے جس مقام پر فائز تھے وہاں پہونچ کر اصلاح اعمال اور مکافات عمل کا یہ شدید احساس کتنے لوگوں میں پیدا ہوتا ہے؟ جگر صاحب اس معاملہ می، بلا مبالغہ اپنی مثال آپ تھے۔

علماء اور دین دار طبقہ کی محبت اور عظمت جگر صاحب کے دل میں رچی بسی تھی ان کے سفر حج کے موقع پر جب حجاز میں انہیں شاہی مہمان بننے کی پیش کش ہوئی تو اپنے رفیق سفر مولانا اویس صاحب ندویؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اگر مولانا بھی شاہی مہمان ہوں گے تو مجھے قبول ہے ورنہ نہیں''۔

مخدومی مولانا ابوالحسن علی صاحب ندویؒ کے نام آئے ہوئے مشاہیر کے خطوط کے فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے جگر صاحب کے ایک خط پر نظر پڑی جسے پڑھ کر جگر صاحب کے رجوع الی اللہ، انابت اور احتساب نفس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت المحترم! زاد اللہ کرمکم۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھ جیسے واقعتاً ننگ اسلام وننگ خلائق پر آپ جیسے بزرگان ملت کی توجہات بے پایاں میرے لئے باعث فخر و ناز بھی ہیں اور باعث اذیت روحانی بھی؛ لیکن اس طرح کی اذیت روحانی جس پر بہت سی سچی مسرتیں بھی نثار کی جا سکتی ہیں، مولانائے محترم! میں آپ حضرات کا جس حد تک

عقیدت مند ہوں ہر شخص اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا، خود اپنے متعلق جو کچھ جانتا ہوں معلوم نہیں وہ کس حد تک صحیح ہے اور کس حد تک غلط، تاہم بزرگوں کے فیضان توجہ کی یہ دولت ہے کہ احتساب نفس سے غافل نہیں رہتا؛ لیکن محض احتساب نفس بھی ایک طرح کی بیماری ہے، تمام عمر بے عملی و بدعملی میں بسر ہوئی اب ان سے ایک ربط خاص پیدا ہو چکا ہے اور قوائے عمل مضمحل و مفلوج، روح و دل روتے رہتے ہیں، دین کی طرف جانا چاہتا ہوں؛ لیکن بے دینی کی جانب قدم مڑ جاتے ہیں، اکثر و بیشتر ایسا محسوس کرتا رہتا ہوں، جیسے میری تمام تر زندگی دلدل میں پھنس گئی ہے اور اب اس سے رہائی کی بظاہر کوئی توقع نہیں، اس عالم مایوسی میں بھی خدا جانے کیوں دل گواہی دیتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر مجھے برباد نہ ہونے دے گا، معلوم نہیں یہ حدیث نفس ہے یا حقیقتاً پیام غیب''

خادم جگر

جگر کی شاعرانہ عظمت کے قائل اور خوشہ چین ہزاروں ہیں؛ مگر ان کی انسانی شرافت اور اسلامی اخلاق کے مقلد نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں، آج کی دنیا کو ''شاعر جگر'' کی جتنی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ جگر ایک شریف انسان کی ضرورت ہے۔ جگر اپنی زندگی ہی میں ''اس انسان'' کے متلاشی تھے اور اس کی کم یابی پر مرثیہ خواں:

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے

جگر کے کلام کی خوبیوں اور اردو غزل کو تب و تاب بخشنے میں ان کی خدمات کا ذکر یہاں مقصود نہیں تھا۔

ان سطور کے محرک ذاتی تاثرات اور دلی جذبات ہیں یہ ''حدیث دل'' ہے، جگر صاحب کے فن پر کوئی تنقیدی مضمون اور تبصرہ نہیں۔

جگر آج ہم میں نہیں؛ مگر ان کی یاد سے ہزاروں سینے معمور ہیں اور جب تک وقت کے ساز پر یادوں کی مضراب کا عمل جاری رہے گا اس وقت تک جگر پر آنسو بہانے والے اس دنیا میں موجود رہیں گے۔

''مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے''

# حضرت حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمیؒ

مولانا بدر الحسن صاحب قاسمی

الکویت

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے عہد زریں میں دار العلوم دیوبند کے ماتحت جامعہ طبیہ بھی قائم تھا جہاں سے سینکڑوں علماء، حکیم وطبیب اور بعد میں بی یو ایم ایس کا کورس کر کے ڈاکٹر پیدا ہوئے جو انقلاب کے ساتھ بے نشان ہو گیا۔

کریدتے ہو جو اَب راکھ جستجو کیا ہے؟

حضرت حکیم عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے تعارف کیلئے یہی کافی ہے کہ ان کے والد حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث رہے ہیں جبکہ انکے چھوٹے بھائی مولانا سعید الأعظمی عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے چیف ایڈیٹر اور دار العلوم ندوہ العلماء کے مہتمم اور مایہ ناز استاذ ہیں۔

حکیم صاحبؒ اسی خانوداہ کے ایک فرد، ایک اچھے عالم، ماہر استاذ، نامور حکیم، بہترین مصنف اور اچھے شاعر واَدیب سب کچھ تھے، اور ساتھ ہی الہٰ آباد کی خانقاہ شاہ وصی اللہ کے فیض یافتہ معمولات کے پابند صوفی اور بزرگ بھی تھے۔

سن و سال کے فرق اور عمر میں غیر معمولی تفاوت کے باوجود حکیم صاحبؒ کے ساتھ برسہابرس تک میرا تعلق انتہائی بے تکلفی کا رہا ہے اور انکی مشفقانہ اَدائیں اس طرح کی تھیں کہ بے تکلف مجلسوں میں اِس کا احساس ہی نہ ہو پاتا تھا کہ وہ بڑے ہیں ہم چھوٹے، وہ بزرگ ہیں اور ہم نا پختہ کار۔

بعض احباب اَز راہ مذاق انکو ''حکیم لدنی'' بھی کہا کرتے تھے لیکن ان پر یہ لقب اس اعتبار سے بیحد چسپاں تھا کہ علم طِب سے انکی واقفیت تمامتر سماوی فیض اور کراماتی انداز کی تھی۔ انہوں نے اس فن کو باقاعدہ پڑھا نہیں تھا لیکن انہوں نے سالہا سال تک بڑے بڑے اطباء وحکماء کی موجودگی اور منافست اور مقابلہ آرائی کے ماحول میں اس فن کی نہ صرف اہم ترین کتابیں پڑھائی ہیں بلکہ متعدد

تصنیفیں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔

وہ خود اپنے اس کمال کو قدرت کا عطیہ اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ کی توجہ کا نتیجہ اور کرامت شمار کرتے تھے۔

انہوں نے بار ہا اپنی یہ داستان سنائی کہ الٰہ آباد خانقاہ میں رہنے کہ دوران حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ مرحوم نے ان سے ایک دن اچانک یہ فرمایا کہ تم طِب کی کتابیں دیکھا کرو، اس عجیب و غریب ہدایت پر انہیں خود بیحد حیرت ہوئی اور ایک لمحہ کیلئے خود شاہ صاحبؒ کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے انکے ذہن میں آنے لگے۔

لیکن ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کسے خبر تھی کہ شاہ صاحبؒ کی ہدایت کے کچھ ہی عرصہ بعد جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کیلئے ایک استاذ کی جستجو ہوگی اور قرعہ فال حکیم صاحبؒ کے نام نکلے گا؟ حکیم صاحب کو اُس وقت حضرت شاہ صاحبؒ کی بصیرت اور کرامت کا یقین آیا اور پھر ساری زندگی انہوں نے شاہ صاحبؒ کو کبھی فراموش نہیں کیا اور ہر نشست و برخاست میں ان سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔

حضرت شاہ صاحب کے طریقۂ اصلاح، انکی مجذوبانہ شان، انکی کرامتوں، انکی غیر معمولی بصیرت اور انکی عالمانہ عظمت کا ذکر تقریباً ہر دن ہی بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔

انکے ایسے واقعات بھی سناتے جسکی زد خود اُن پر پڑتی تھی اس سلسلہ کا انہوں نے یہ واقعہ بھی بار ہا سنایا کہ اپنی زبان کی تیزی اور تنقید کی بے احتیاطی میں کوئی جملہ انہوں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الأعظمیؒ کے بارے میں کہہ دیا شاہ صاحب اس پر سخت ناراض ہوئے اور انکے پاس جا کر معافی مانگنے کا حکم فرمایا کہ تمہاری بات سے ایک عالم کی شان میں بے اَدبی ہوئی ہے، لہذا وطن جا کر ان سے معافی مانگو پھر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ فلاں آدمی کو اپنے ساتھ لے لو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تم صراحت کے ساتھ معافی مانگنے کے بجائے اپنی ذہانت کی وجہ سے ایچ پیچ سے کام لو اور معافی مانگنے کا جو مقصد ہے وہ پورا نہ ہو۔ اس واقعہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کی مربیانہ شان بھی ظاہر ہوتی ہے۔

حکیم صاحبؒ اپنی غیر معمولی ذہانت، طبیعت کی بے باکی اور حاضر جوابی کی وجہ سے بآسانی کسی کے قابو میں آنے والے نہ تھے۔ بڑے بڑوں کو بھی خاطر میں نہ لانے کا مزاج رکھتے تھے۔ لیکن یہ محض حضرت شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ کی شان اصلاح اور پرتاثیر صحبت تھی کہ جس نے حکیم صاحبؒ

کے ہاتھوں سے جنت کو جانے نہ دیا اور وہ اپنی بے باکی کے باوجود خانقاہی اُصولوں پر چلنے میں کامیاب رہے۔

ہماری نظر میں حضرت شاہ صاحبؒ کی طب والی کرامت کے مقابلہ میں یہ کرامت کسی طرح کم نہ تھی کہ حکیم عزیز الرحمٰن صاحبؒ جیسا آزاد طبع کا پیکر، شب و روز خانقاہی معمولات کا پابند رہا، حقیقت یہ ہے کہ ہوا میں اڑنے اور اڑانے کے مقابلہ میں انسان بنانے کی کرامت کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

پنجوقتہ نماز ہی نہیں تہجد کا دائمی معمول، نفلی روزوں کا اہتمام، اور دیگر صباحی و مسائی اوراَوراد و اَذکار کی ہر حال میں پابندی کی امید ایک ایسے شخص سے کب کی جاسکتی تھی جو شاعرانہ ذوق، آزادانہ مزاج رکھنے والا اور شب و روز نقد و تبصرہ کا خوگر ہو، حکیم صاحبؒ کی زندگی میں وارستہ مزاجی کے ساتھ معمولات کی پابندی کو دیکھ کر حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ کے فیضان نظر کی تأ ثیر پر ہمارا اعتقاد اور بڑھ جاتا تھا۔ کہ یہ ''مکتب کی کرامت'' نہیں انکی کیمیا گر صحبت کا اثر ہے۔ اب نہ تو حضرت تھانویؒ اور شاہ وصی اللہ صاحبؒ جیسے مربی رہے اور نہ ویسی خانقاہیں۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

دیوبند کے قیام کے دوران کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جسمیں حکیم صاحبؒ، استاذ العلماء حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی اور اس ناچیز کی بے تکلف اور مزاحیہ جملوں اور قہقہوں سے بھرپور مجلس منعقد نہ ہوتی ہو۔

حکیم صاحبؒ کی زبان ہم سب سے تیز چلتی، فقرہ بازیوں اور اپنی طرف سے دفاع میں احقر بھی پیچھے نہیں رہتا، حضرت علامہ بہاری تو استاذ اکبر تھے ہی ان کا احترام ہم سبھوں کے دل میں تھا، دلچسپی لینے اور قہقہہ لگانے میں حضرت مفتی صاحب بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ہماری مجلسیں عام طور پر عصر کی نماز کے بعد ہوتیں اور حکیم صاحبؒ کی نکتہ آفرینیوں اور تبصروں سے زعفران زار رہا کرتی تھیں۔

حکیم صاحبؒ کے ذہن میں سننے اور نہ سننے کے لائق واقعات کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا مذاقاً انکی باتیں سنکر کبھی کبھی میں کہتا کہ ''اَرواح ثلاثہ'' میں شامل ''امیر الروایات'' کی طرح آپ بھی ایک ''عزیز الروایات'' مرتب کر دیجئے۔ ان کے بیان کردہ واقعات کا تعلق علماء، شعراء اور مختلف طبقہ کے لوگوں سے ہوا کرتا تھا اور اسے وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔

حکیم صاحبؒ سے وابستہ شخصیتوں میں ایک اچھی شخصیت ڈاکٹر اعزاز الدین بھوپالی مرحوم کی بھی تھی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت ہی باوقار اور صالح انسان تھے، دارالعلوم کے فارغ طلبہ کو انگریزی زبان سکھانے اور تاریخ وجغرافیہ وغیرہ کی تعلیم دینے کیلئے انکو لایا گیا تھا۔ بڑے ذاکر وشاغل آدمی تھے غالبًا ان کا روحانی رشتہ بھوپال کے شاہ یعقوب مجددی صاحبؒ سے تھا۔ اپنے اُصولوں کے بیحد پابند، اپنا کام خود کرنے کے عادی اور ہمہ وقت ذکر وشغل میں رہنے والے آدمی تھے۔ حکیم صاحب کی فقرہ بازیوں اور بے تکلفانہ مذاق کا سلسلہ ڈاکٹر صاحبؒ کے ساتھ بھی رہا کرتا تھا۔

ایک دن کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحبؒ آپ اس قدر ذکر کرتے رہتے ہیں کہ خدشہ ہونے لگا ہے کہ کہیں جنت کے اُس پار نہ پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا جواب صرف مسکراہٹ اور یہ کہ حکیم صاحب آپ کیا فرمارہیں ہے؟!

حکیم صاحبؒ کی میری رہائش گاہ پر اکثر آمدورفت رہتی تھی جس کی وجہ ذہنی ہم آہنگی اور مزاجی یگانگت تھی، مجھے فطری طور پر اور انکو خانقاہی نسبت کی وجہ سے تھانوی ذوق ومزاج ملا تھا، چنانچہ تعلیمی اداروں میں ہم لوگ سیاسی خرخشوں کے قائل نہیں تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے احاطہ میں سیاسی دنگل بازیوں کی زندگی ہمیں یکسر پسند نہیں تھی اور جو حلقہ اس سلسلہ میں پیش پیش تھا اس سے کبھی مزاجی مناسبت پیدا نہ ہوسکی، ہمیں دارالعلوم دیوبند میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی علمی جلوہ ریزیاں اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہمہ جہت تجدیدی و اصلاحی عطر بیزیاں پسند تھیں اور اسے ہی ہم دارالعلوم کی تاریخ کا حاصل سمجھتے تھے۔

دارالعلوم میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہنگاموں اور اسٹرائیکوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن حکیم صاحبؒ اس سے سخت متنفر رہے اور برملا تنقیدوں سے بھی خطرات کے باوجود کبھی باز نہیں آئے۔

حکیم صاحبؒ جامعہ طبیہ کے احاطہ میں رہتے تھے لیکن سخت ہنگاموں کے زمانہ میں بھی روڈ پار کر کے دارالعلوم کی مسجد میں فجر سمیت ہر نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے انکے معمول میں کبھی فرق نہیں آیا جو یقیناً انکی استقامت کی دلیل اور خانقاہی تربیت کا اثر تھا۔

حکیم صاحبؒ شعر فہمی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے انہیں اُردو اور فارسی کے سینکڑوں اشعار یاد تھے اور نقد شعر کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ اردو کے مشہور شعراء غالب، اقبال سے لیکر حسرت، جگر اور اصغر وغیرہ کے بارے میں ماہرانہ تبصرہ کیا کرتے تھے فراق، اختر شیرانی، ساحر، مجاز وغیرہ کے کلام ہی نہیں

لطائف اور طباعی و ذہانت کے واقعات کا ذکر بھی بڑی دلچسپی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ایک خوش شکل نوجوان نے مسواک دی تو عربی میں گویا ہو گئے:

أعطيتني السواك أخي لا أرى سواك

من شجرة الأراك أخي لا أرى سواك

ظاہر ہے کہ یہ انکی ذہانت اور حاضر دماغی کے ساتھ قدرت کلام کی بھی دلیل تھی۔ شعر و سخن پر گفتگو کا لطف اس وقت زیادہ بڑھ جاتا تھا جب محترم قاری شبیر احمد صاحب ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے یا کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت قاری شبیر احمد صاحب کو اللہ نے غیر معمولی ذہانت، فن قراءت میں مہارت کے ساتھ شعر و شاعری کا بڑا پاکیزہ ذوق عطا فرمایا ہے۔ خود بھی اچھا شعر کہتے ہیں اور اساتذہ سخن اور نامور شعراء کے ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد بھی ہیں اور اس وقت تو ایک مدرسہ کے بہترین مہتمم اچھے خطیب اور داعی و مصلح کچھ ہیں۔

حکیم صاحبؒ کے یہاں چائے پینے، دنیا بھر کے مسائل پر تبصرہ کرنے اور تنقیدیں سننے اور سنانے کا لطف حضرت قاری صاحب کی موجودگی میں اور دوبالا ہو جایا کرتا تھا۔

حکیم صاحبؒ میں شعر و سخن ہی نہیں انسانوں کی ظاہری شکل و صورت سے لیکر باطنی اوصاف و خصوصیات تک پڑھنے کا بڑا سلیقہ تھا، معاملہ کو ایک نظر میں تاڑ جایا کرتے اور پھر تبصرہ کئے بغیر بھی نہ رہتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ جب ایک صاحب نئے نئے دارالعلوم میں استاذ مقرر ہو کر آئے تو مسجد کے گیٹ پر ان کی شکل دیکھتے ہی کہنے لگے مولوی بدر سر چھوٹا' ڈاڑھی گھنی' اور کرتا لمبا' مجھے تو کسی فتنہ کی بو آرہی ہے، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ہی دنوں بعد کئی حادثات انکی ذات سے متعلق رونما ہوئے تو کہنے لگے کہ دیکھو میں نے کیا کہا تھا؟

ظاہر ہے کہ قیافہ شناسی ایک فن ہے لیکن اسکی حیثیت قرینہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی احکام میں اسے دلیل کا نہیں محض قرینہ اور علامت کا درجہ دیا گیا ہے۔

حکیم صاحبؒ کی کچھ باتوں کو ہم انکے ''ذوقیات'' کے خانے میں ڈالتے، ہمیں یقین نہیں ہوتا اور حکیم صاحبؒ کو اپنے نکتہ پر اصرار رہتا تھا۔

اکثر و بیشتر گرمی کی شدت کے زمانہ میں بدن کھول کر پوربی انداز میں صرف ایک لنگی یا

بنیاین اور لنگی پہن کر جامعہ طبیہ کے احاطہ یا اپنے کمرہ میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے یا حصن حصین پڑھتے ہوئے نظر آتے تھے، یہ انکی خانقاہ سے وابستگی کا کرشمہ تھا ورنہ اس قدر ذہین اور آزاد طبع انسان معمولات کا اس قدر پابند نہیں ہوسکتا تھا۔

ان میں دینی غیرت وحمیت تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی، اور اپنے شیخ، اور حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر دیوبند سے بے پناہ عقیدت بھی تھی جس کا اثر انکی بات چیت اور طریق زندگی میں نمایاں رہتا تھا۔

حکیم صاحبؒ کو اللہ تعالی نے تصنیف وتالیف کا اچھا سلیقہ دیا تھا وہ بے حد زود نویس تھے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی سوانح، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور متعدد کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔

عربی زبان سے ترجمہ پر آئے تو شیخ محمد بن ناصر العبودی کی افریقیہ الخضراء کا ترجمہ شاداب افریقہ کے نام سے اور شیخ زائد کی سوانح حیات کا ترجمہ کر ڈالا۔ علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے رسالہ خاتم النبیین کا بھی فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

لیکن ان کے کارناموں میں اہم ترین چیز انکی تیار کردہ میڈیکل ڈکشنری ہے جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے اور جو انکی قابلیت کی دلیل ہے، اس ڈکشنری نے ہی انکے لئے حج بیت اللہ کی راہ آسان کی۔ وصی میڈیکل ڈکشنری کے علاوہ انہوں نے ایک اور سہ لسانی طبی ڈکشنری بھی لکھدی ہے جو انکے کمال اور عربی اُردو اور انگلش پر عبور کی علامت ہے۔

دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی عظمت کا اور انکی معصومانہ اداؤں کا خاص طور پر ذکر کرتے تھے اور انکے خلاف ایک حلقہ کے طرف سے کئے جانے والے غلط پروپیگنڈوں سے سخت کبیدہ خاطر رہتے تھے۔

رفقاء واحباب وہم عصروں میں جامعہ طبیہ کے اساتذہ، ڈاکٹر اعزاز الدین صاحبؒ، سید ازہر شاہ قیصرؒ، مولانا حامد الأنصاری غازی صاحبؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب اور عزیزوں میں اس ناکارہ کے ساتھ نشست وبرخواست تقریباً روزانہ ہی رہا کرتی تھی۔ طبیعت میں اللہ نے بڑی صفائی اور نفاست رکھی تھی ہمیشہ صاف ستھرے لباس میں رہتے تھے۔

دار العلوم سے علاحدگی کے بعد کچھ عرصہ کیلئے وہ دبئی چلے گئے تھے جہاں ان کا اکلوتہ بیٹا

ملازم تھا۔ حکیم صاحبؒ نے وہاں عملی طور پر مطب بھی کھول لیا تھا اور علاج و معالجہ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔

پھر وطن میں آ کر مقیم ہوئے اور حالات کی نا مساعدت کے باوجود نہ انکے معمولات کی پابندی میں فرق آیا اور نہ تصنیف وتالیف کے مشغلہ میں خلل واقع ہوا۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

عمر کے آخری ایام میں ''لغات حدیث'' کے نام سے ایک طویل کتاب کی تالیف میں وہ مشغول تھے اور حضرت مولانا سعید الأعظمی صاحب کی اطلاع کے مطابق تقریباً تین ہزار صفحات وہ لکھ چکے تھے۔

رمضان المبارک میں اس کے چند صفحات انہوں نے میرے پاس بھجوائے تھے تا کہ اس کی طباعت وغیرہ کا کہیں سے نظم ہو جائے، ان اوراق کو میں پورے طور پر پڑھ بھی نہیں پایا تھا کہ رمضان المبارک کے مہنیہ میں اور غالباً عشرہ اَواخر کی آمد کے ساتھ ہی ان کا وقت موعود آپہونچا اور وہ ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے گئے جسکی اطلاع بھی مجھے دیر سے ملی۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

فارسی کے مشہور شاعر قاآنی کا اپنے معاصر شاعر خاقانی کی پہلے موت پر یہ شعر انہوں نے ہی سنایا تھا کہ میرا خیال یہ تھا کہ خاقانی میرا مرثیہ کہے گا لیکن افسوس کہ مجھے ہی اس کا مرثیہ کہنا پڑ رہا ہے:

ہمیں گفتم کہ خاقانی دریغا گوئے من باشد
دریغا من شدم آخر دریغا گوئے خاقانی

اللہ تعالیٰ حکیم صاحبؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور انکی ہر طرح کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور انہیں صدیقین وصالحین کے زمرہ میں شمار فرمائے۔ آمین

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

# ایک مثالی استاذ ومربی

محمد فہیم قاسمی گورکھپوری

معاون مدیر: ماہنامہ المناظر

دنیائے فانی سے دنیائے باقی کی طرف کوچ تو سبھی کو کرنا ہے، باقی رہنے والی ذات صرف اللہ تعالی کی ہے، ہاں! کچھ لوگوں کا جانا بے شمار افراد کو غم زدہ کردیتا ہے، ۱۵رصفر المظفر کو جس ذات گراں مایہ نے اس فانی دنیا کو الوداع کہا، وہ علم حدیث کے استاذ، عربی ادب کے ماہر، تصنیف و تالیف کے شہسوار، تقریر و خطابت میں اسٹیج کی رونق، ترجمانی میں لاثانی، ایک باکمال استاذ اور باصلاحیت منتظم کی ہے، وہ ہستی استاذ المکرّم حضرت مولانا عبدالرشید بستوی علیہ الرحمہ کی ہے، جن کی علمی لیاقت وصلاحیت کا تعارف عاجز کیا کرائے، حضرت الاستاد اپنی علمی وعملی صلاحیتوں کی بنیاد پر، استاذ المکرّم حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کے چہیتے اور معتمد تھے۔

احقر ۲۰۰۴ء میں جامعہ امام انور کی جامع مسجد کے اندرونی حصے میں امتحان داخلہ کی کاپی لکھ رہا تھا کہ لمبے قد، مناسب صحت، درمیانی آنکھوں، کشادہ پیشانی، سانولے سرخی مائل رنگ، سفید کرتے پائجامہ میں ملبوس، سر پر پنج کلی ٹوپی لگائے ہوئے، ایک پروقار، بارعب شخصیت مسجد میں داخل ہوئی، یہ شخصیت حضرت الاستاد مولانا عبدالرشید بستوی علیہ الرحمہ کی تھی، جو اس وقت بھی صدرالمدرسین تھے، یہ حضرت الاستاذ کا پہلا دیدار تھا۔

بحمداللہ احقر کا داخلہ عربی ششم (جو اسی سال قائم ہوا تھا) میں ہوگیا، ظہر بعد کے دو گھنٹے حضرت الاستاد ہی سے متعلق تھے، جن میں مشکوۃ شریف کے آخر کا ایک جز اور موطا امام محمد کے اسباق تھے، حضرت پابندی سے درس میں حاضر ہوتے، اکثر اپنی دو یا تین سال کی بچی کی انگلیاں پکڑے اور کبھی اسکے برادر اکبر کو ساتھ لیے ہوئے درس میں جلوہ افروز ہوتے، اکثر خود ہی عبارت پڑھتے مختصر الفاظ میں متعلقہ عبارت کے مناسب، تسلی بخش تشریح فرماتے اور یہی طرز تشریح اختلافی مسائل میں بھی اختیار فرماتے اور طلبہ اس تشریح سے بالکل مطمئن ہوتے جاتے۔

حدیث پاک کا جز ہے " نصرت بالرعب" کہ رعب کے ذریعے میری مدد فرمائے گی، حدیث رسول کے درس دینے والے کی اس کے ذریعے سے مدد کیوں نہ فرمائی جاتی، یقیناً حضرت الاستاد کی شخصیت بہت ہی بارعب تھی؛ لیکن طبیعت نہایت ہی نرم، چال انتہائی سبک، نگاہیں نیچی،

زیارت و ملاقات کے وقت خوش دل، بات کرتے وقت ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں، طلبہ پر نہایت شفیق اور مہربان باپ کی طرح تھے۔

دوران تعلیم احقر نے عربی انشاء کے مشق کی درخواست کی، تو حضرت الاستاذ نے اس درخواست کو نہ صرف یہ کہ شرف قبولیت سے نوازا؛ بلکہ حوصلہ افزائی بھی فرمائی، اور مسلسل پورے سال بعد نماز عصر جامعہ کی مسجد میں پڑھاتے رہے، پھر احقر دارالعلوم وقف میں دیوبند میں علمی تشنگی بجھانے کا موقع حسین موقع ملا، تو ملاقات میں گرچہ کمی واقع ہوگئی، لیکن جب بھی حاضری کا موقع ملتا دل باغ باغ ہوجاتا۔

فراغت کے بعد وقفہ وقفہ سے حضرت الاستاذ سے ضرور بات ہوتی تھی، جب بھی رابطہ ہوتا، آپ نہایت خوش ہوتے اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازتے۔

ابھی گزشتہ سے پیوستہ مہینے (۱) ایک ضرورت سے حضرت الاستاذ سے گفتگو ہوئی، ضرورت کیا بیان کرتا، حضرت الاستاذ نے سلام کے بعد فرمایا: بیٹے! میں بہت بیمار ہوں، یہ سن کر جو ہستی ہمیشہ دعاؤں سے نوازتی رہی، یہ بندہ عاصی اس کی صحت و عافیت کی دعائیں کرنے لگا اور حضرت الاستاذ کی مقبول دعائیں لے کر فون رکھ دیا اور دنیا کی شب و روز میں کھوگیا، بدقسمتی سے دنیا کی مصروفیات میں اتنا منہمک ہوا کہ دوبارہ رابطہ کرنے کی سعادت نہ مل سکی، معمول کے مطابق بعد نماز مغرب اپنے کاموں میں لگا ہوا تھا کہ اچانک بذریعہ میسیج یہ خبر موصول ہوئی کی مولانا عبدالرشید بستوی کا انتقال ہو گیا، یہ خبر کیا تھی ایک آسمانی صائقہ تھی، جس سے پورا وجود ششدرر رہ گیا اور حیرت واستعجاب میں دل یہ صدائیں لگانے لگا کی کاش یہ خبر سچ نہ ہوتی؛ مگر رفیق محترم مولانا بدرالاسلام صاحب قاسمی (استاد جامعہ امام انور شاہ دیوبند) کی تصدیق نے اس خبر کو سچ ہی ثابت کردیا، ان کے انتقال کی خبر اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ مسلسل تصدیقات، نماز جنازہ، لحد میں دفن ہوجانے کے بعد بھی حضرت الاستاذ کی موت کا یقین نہیں ہوتا لیکن میرے یقین نہ کرنے سے کیا ہوسکتا ہے، جبکہ حضرت الاستاذ اپنی تمام خوبیوں اور نیرنگیوں کو سمیٹ کر ۱۵/صفر المظفر ۱۴۴۰ بمطابق ۲۵/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو ہمارے درمیان سے رخصت ہوچکے؛ البتہ اپنی علمی کاوشوں اور کارناموں سے حضرت الاستاذ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اللہ تعالی ان کی قبر کو نور سے منور فرمائے دین اسلام کی خدمت کا بہترین بدلہ عطا فرمائے، نیز پسماندگان ومتوسلین اور جامعہ کے منتظمین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے واعظان قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخن ور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیئے

# انٹرویو

## مولانا مسعود علی ندویؒ

دارالمصنفین اعظم گڈھ

مولانا مسعود علی ندویؒ مولانا شبلی کے شاگرد وعقیدت کیش اور مولانا سید سلیمان ندوی کے رفیق کار اور ساتھی ہیں، ایسی باغ و بہار، حاضر جواب، بذلہ سنج اور منتظم و با تدبیر شخصیت ان کے معاصرین میں شاید ہی کوئی دوسری ہو۔ یہ انٹرویو مولانا شبلی سے ان کی عقیدت ومحبت اور ان کے جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہے۔(ادارہ تعمیر حیات لکھنؤ)

عمر شاید یہی پندرہ سولہ سال کی ہوگی اور طالب علم بھی ندوہ کے تیسرے یا چوتھے درجہ کا تھا، کہ معلوم ہوا مولانا مسعود علیؒ صاحب تشریف لائے ہیں، بس سارا کام اور کام ہی کیا کھیل کود کے سارے مشغلوں کو چھوڑ سیدھا مہمان خانہ پہونچا، وہاں وسط کمرہ میں ایک بہت برگزیدہ شخصیت بیٹھی ہوئی نظر آئی، ملنے کی ہمت نہ ہوئی، واپس چلا آیا، دوسرے دن صبح والد صاحب کے ساتھ دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور مختصر تعارف کے بعد تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا، اس عرصہ میں مولانا نے جو گفتگو فرمائی اس سے کل کا خوف جاتا رہا، اور ایک طرح کا انس محسوس ہونے لگا، جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی خردوں کے خرد کے ساتھ بے پناہ محبت واپنائیت کا اظہار، یہ تو تھی پہلی ملاقات، اس کے بعد بھی اکثر مولانا ندوے تشریف لاتے رہے اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

جو حضرات مولانا سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مولانا کی مجلسوں میں کیا لطف آتا ہے اور پوری محفل کیسی زعفران زار بنی رہتی ہے، ادھر چند سالوں سے مولانا کی طبعت اکثر وبیشتر ناساز رہتی ہے، دو تین ہفتہ قبل اخبار میں آچکا تھا کہ فالج کا حملہ بھی ہوگیا ہے۔ دارالمصنفین کے جبلی کے موقع پر اعظم گڈھ پہونچا تو سب سے بڑی تمنا یہ بھی تھی کہ شبلیؒ وسلیمانؒ کے کارواں کے اس مسافر کی بھی زیارت ہوجائے گی، دارالمصنفین پہونچتے ہی مولانا علی میاںؒ صاحب مدظلہ اور والد صاحب وغیرہ کے ہمراہ فوراً ہی مولانا کے کمرے میں حاضر ہوا، مولانا ان حضرات کو دیکھتے ہی اور یہ حضرات مولانا کو دیکھتے ہیں اشکبار ہو گئے، شاید بھولی بسری یادوں نے دل کے اضطراب کو چھیڑ دیا تھا، آپ

مولانا کی شام زندگی کی شفق تیزی سے پھیلتی دیکھ کر اور حسرت بھرے اشعار پڑھتے ہوئے سن کر تمام حاضرین شدت جذبات سے بے قابو ہو رہے تھے، اس وقت عجیب کیفیت ہوئی جب مولانا نے حسب ذیل شعر بڑے اثر کے ساتھ پڑھا؎

حسرت کے اس مسافر بے کس کی روئیے

جو تھک گیا ہو بیٹھ کر منزل کے سامنے

شاید اس وقت مولانا نے بھی ان حضرات کے چہرہ پر کتنی ہی کہانیاں ثبت دیکھی ہوں گی، جن کے سہارے ماضی کے دیس میں پہونچ چکے ہوں گے، جہاں جوانی کی اولوالعزمیاں رہی ہوں گی، دارالمصنفین قائم ہو رہا ہوگا، ندوہ کے سلسلہ میں مدراس کا سفر ہو رہا ہوگا، سید سلیمان ندویؒ کا ساتھ رہا ہوگا، ندوہ کی مسجد تعمیر ہو رہی ہوگی اور نہ جانے کیا کیا نظر آ رہا ہوگا، مولانا کے قدیم دوست اور عقیدت کیش یوسف صاحب اور والد صاحب زیادہ روتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ ابھی اتنا رو رہے ہو تو جب میں مرجاؤں گا تو کتنا روؤ گے، آہ کتنی حسرت ہے اس کے ایک جملہ میں، میں یہ سب دیکھ رہا تھا اور یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی شخصیت ہے جو اب سے چند سال پہلے جب ندوہ میں رواق رحمانی تعمیر ہو رہی تھی شبلی ہوسٹل کے سامنے جلوہ افروز تھی اور اساتذہ وطلباء کا ایک ہجوم مولانا کے اردگرد اکٹھا تھا اور ہر ہر منٹ پر قہقہوں کا طوفان امنڈ رہا تھا اور آج آنسو ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگ وہاں سے چلے آئے اسی دن شام کو دوبارہ والد صاحب کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، تو مولانا نے فرمایا کہ اپنی زندگی میں ہر کام میں کامیابی حاصل کی اور خدا کا شکر ہے کہ آج جوبلی کو بھی کامیابی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں اب میرے دل میں کسی طرح کی کوئی تمنا اور حسرت باقی نہیں ہے، پوری طرح کا اطمینان ہے۔ اس وقت یہ گفتگو سن کر بغیر کسی تمہید کے میں نے سوال کر دیا۔

س: مولانا شبلی نعمانیؒ کے متعلق آپ کے کیا نظریات ہیں؟

مولانا شبلی نعمانیؒ کا نام سننا تھا کہ مولانا پر ایک وارفتگی کی کیفیت طاری ہوگئی اور بہتے ہوئے آنسو دل کی کیفیت کی پوری ترجمانی کر رہے تھے، اسی حالت میں مولانا نے جواب دیا، مولانا شبلیؒ کے متعلق میرے کیا نظریات ہیں وہ میرے لئے سب کچھ تھے اور یہی میرے نظریات ہیں، یہ کہہ کر مولانا پر ایک گہری خاموشی طاری ہوگئی، اور پوری فضا میں ایک اداسی پھیل گئی، یہ صورت حال دیکھ کر

آنسو پوچھتے ہوئے چپکے سے میں باہر نکل آیا اور دل ہی دل میں شرمندہ تھا کہ کیوں میں نے زخم دل کے ٹانکے کھول دیئے۔

تیسرے دن میں نے دیکھا کہ رکشہ پر سوار مولانا دارالمصنفین کے احاطہ میں جوبلی کے انتظامات دیکھ رہے ہیں، میں بھی رکشہ کے پیچھے چل دیا، ایک جگہ تھوڑی دیر کے لئے رکشہ رکا تو میں نے مولانا سے پھر ایک سوال کر ڈالا:

س: ندوہ کے قیام کے زمانہ میں ندوہ کا عمومی تخیل کیا تھا؟

مولانا نے فرمایا کوئی تخیل نہیں تھا، کچھ نہیں تھا جو کچھ تخیل آیا اور جو نظریات قائم ہوئے سب مولانا شبلی نعمانیؒ کے آنے کے بعد ہوا، اس سے پہلے تو وہ ایک مدرسہ تھا۔

مولانا خاموش ہوئے تو فوراً ہی میں یہ پوچھ بیٹھا۔

س: دارالمصنفین کے ابتدائی دور کے کیا حالات تھے؟

مولانا نے فرمایا کہ مجھ کو مولانا شبلیؒ کی علالت کا تار ملا فوراً اعظم گڈھ پہونچا، وہیں سے میں نے سید سلیمان ندویؒ کو تار دے کر بلایا، کچھ دنوں کے بعد مولانا کا انتقال ہوگیا، مولانا کے رشتہ دار اس بات پر مصر تھے کہ مولانا کے تمام مسودات وغیرہ وہ لے جائیں گے میں نے کہا یہ نہیں ہوسکتا، گاؤں سے آدمی لے آؤں گا اور تمام چیزیں یہیں رہیں گی، اور دارالمصنفین قائم ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، تمام مخالفتیں دب گئیں اور آج آپ دارالمصنفین کو اس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔

مولانا یہ کہہ ہی رہے تھے کہ رکشہ آگے بڑھ گیا، اور مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ سامنے کے اونچے درخت اور باعظمت در و دیوار یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

☆----☆----☆

# جو چھبے دل میں وہی تنکے لئے

محمد فہیم قاسمی گورکھ پوری

## جوار حرم کی عظمت اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

مدرسہ کی مسجد (مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ) تاریخی حیثیت کے علاوہ ہندوستانی طرز تعمیر کا واحد نمونہ ہے، صحن حرم میں زمزم کے قریب ''سلطانی کتب خانہ'' کی عمارت تھی، صحن حرم میں اس عمارت کی وجہ سے نماز کے اوقات میں حجاج کو خاص طور پر تکلیف اور زحمت ہوتی تھی، حجاز کے گورنر عثمان نوری پاشا نے وزارت اوقاف قسطنطنیہ کو اس طرف توجہ دلائی کہ کتب خانہ کی عمارت اگر صحن حرم سے اٹھا دی جائے تو زائرین اور حجاج کی آسانی اور سہولت کا باعث ہوگا، یہ درخواست سلطان عبدالحمید مرحوم کے حضور میں منظور ہوئی، کتابیں اور عمارت کا تمام سامان مسجد حرم سے ایک ملحقہ عمارت میں منتقل کیا گیا اور کتب خانہ کی عمارت گرادی گئی، منہدم عمارت کے سامان وغیرہ کے نیلام کا اعلان ہوا، اس خبر کو سن کر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ بے چین ہوئے، کہ جو پتھر اور سامانِ عمارت جوار کعبہ اور صحن حرم میں رہا ہو نیلام کے بعد نہ معلوم کس جگہ اور کس مقام پر خریدنے والے استعمال کریں، حضرت مولانا مرحوم نے عثمان نوری پاشا سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس سامان سے مدرسہ صولتیہ سے متعلق ایک مسجد بنوا دی جائے، جس کی ضرورت بھی ہے، اس تجویز سے حجاز کے گورنر نے اتفاق ظاہر کیا، ملبہ کی قیمت پندرہ سو روپے طے ہوئی، اور یہ صحن حرم سے مدرسہ میں منتقل ہوا۔ ۱۳۰۱ھ میں اس یادگار زمانہ مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، مکہ مکرمہ کے معمار گنبدوں کے بنانے میں مہارت نہیں رکھتے تھے، مسجد کے تینوں گنبد پانی پت کے کرنال کے معماروں کی یادگار ہیں، جو اس زمانہ میں فریضہ حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ معظّمہ آئے تھے، مسجد کی عمارت ۱۳۰۴ھ میں مکمل ہوئی، ہرات کے ایک ذی علم اور خوش قلم وخوش کلام مہاجر جن کو حضرت مولانا مرحوم سے خلوص اور دلی تعلق تھا انہوں نے مسجد کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ لکھ کر اپنے ہاتھ سے محراب کی پیشانی پر کندہ کیا:

بسکہ خوش منظر است ایں مسجد ☆ ما رأی العین مثلہ الثانی

گشت تاریخ ''خان ؟ رحمت'' (۱۳۰۴) ☆ رحمۃ اللہ قل علی البانی

ماہنامہ ذکر وفکر دہلی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی نمبر/۶۲

## قاضی سوار بن عبداللہؒ اور خلیفہ منصور

سوار بن عبداللہؒ خلیفہ منصور کی جانب سے بصرہ کے قاضی تھے، ایک بار دربار خلافت کا فرمان ان کے نام صادر ہوا کہ فلاں قطعہ کی زمین کی بابت جو فلاں تاجر اور افسر فوج کا دعویٰ تمہارے یہاں دائر ہے، اس میں فیصلہ بحق افسر ہونا چاہئے، قاضی ممدوح نے جواب میں لکھا کہ میرے سامنے جو ثبوت پیش ہوا ہے وہ تاجر کے دعوی کو ثابت کرتا ہے پس جب تک اس سے زیادہ زبردست ثبوت فریق ثانی کی طرف سے نہ گزرے، میں تاجر کے حق کو باطل نہیں کرسکتا، خلیفہ نے دوبارہ حکم صادر کیا کہ **والله الذی لا اله الا هو لقد فعنها الی القائد** یعنی قسم خدائے تعالیٰ کی وہ زمین تم کو افسر کو دینی ہوگی، عادل قاضی نے جواب دیا:

"**والله الذی لا اله الا هو لا اخرجنها من يد التاجر الا بحق**" یعنی قسم خدا کی میں زمین تاجر کے ہاتھ سے ناحق نہیں نکال سکتا، اس جواب کو دیکھ کر منصور کے جبروت نے قاضی کے عدل کے سامنے سر جھکا دیا، اور اس نے فخر کے لہجہ میں کہا کہ واللہ میں نے دنیا کو انصاف سے بھر دیا کہ میرے قاضی میرا حکم، حق کے مقابلہ میں رد کر دیتے ہیں۔

الندوہ اشاعت کے بعد/۱۹۹۵

ایک دفعہ اتفاق ہوا کہ لوگوں نے انہیں قاضی صاحب کی شکایتیں دربار خلافت میں پہنچائیں، منصور نے ان کو تحقیقات کے واسطے طلب کیا، یہ خلیفہ کے سامنے حاضر تھے، کہ اس کو چھینک آئی، آداب اسلامی کی رو سے چھینک آئے تو چھینکنے والے کو الحمدللہ کہنا چاہئے اور جب وہ الحمدللہ کہے تو سننے والے یرحمک اللہ کہنا چاہئے (اللہ تجھ پر رحم کرے) خیر خلیفہ کو چھینک آئی تو یہ خاموش رہے، اور دعائے خیر سے اس کو یاد نہیں کیا، منصور ان کی طرف سے پہلے سے بدظن تھا ان کی خاموشی سے اور زیادہ بگڑا اور غصہ سے پوچھا کہ تم نے یرحمک اللہ کیوں نہیں کہا؟ انہوں نے بے ساختہ کہا کہ خلیفہ نے الحمدللہ نہیں کہا۔

منصور: میں نے آہستہ دل میں الحمدللہ کہہ لیا تھا۔

قاضی: میں نے بھی دل میں یرحمک اللہ کہہ لیا تھا، منصور نے یہ سن کر کہا کہ جاؤ تم اپنے کام پر واپس جاؤ، جب مجھ سے نہیں لچے تو کسی سے بھی نہیں لچ سکتے۔　　　(ایضاً)

## مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ آٹوگراف اور سوال

مختار مسعود نے اپنی کتاب ''آواز دوست'' کے دوسرے حصہ ''قحط الرجال'' میں مختلف شخصیات کے آٹوگراف اور ان سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، انہوں نے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے بھی ملاقات کی، ان سے کچھ سوالات کئے، آپ پڑھئے ان سوالوں کے جوابات اور شاہ صاحب کا آٹوگراف۔

میں نے شاہ جی سے جو سوال کیے، وہ سب سود وزیاں کے بارے میں تھے، پہلا سوال یہ تھا کہ گزشتہ چالیس برس جو آپ کی عوامی زندگی پر محیط ہیں، آپ نے برعظیم کے مسلمانوں کو اسلام سے قریب آتے ہوئے دیکھا ہے یا دور جاتے ہوئے پایا ہے، جواب ملا کہ مسلمانوں میں دو طبقے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں، ایک مذہب سے قریب دوسرا اس سے کچھ دور۔ ان دونوں طبقوں کا درمیانی فاصلہ اس چالیس سال میں بہت بڑھ گیا ہے، یہی نہیں؛ بلکہ جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں ان کی تعداد اور قوت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

میں نے دوسرا سوال پوچھا: برعظیم کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ میں زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں ایسے نامور مسلمان ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے ہیں، جس کی مثال نہیں ملتی؛ اگر ان سب کی موجودگی میں اسلام سے بے گانہ ہو جانے والوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوا ہے، تو اس کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، جس کے مسائل آپ کے عہد سے زیادہ الجھے ہوئے اور رہنما آپ کے معیار سے کم پایہ ہوں گے، کیا یہ بات قابل افسوس نہیں کہ جو ملّی سرمایہ آپ کو اسلاف سے ملا تھا، اس سے آپ کا ترکہ کمتر ہو گیا، شاہ جی نے فرمایا: کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لئے کامیابی نہ ہو سکی کہ دوسو برس کی عرصہ میں فرنگی کی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلط جما لیا تھا، آسودہ حال لوگ علی گڈھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصہ میں آئے، جنگ آزادی کی ہمہ ہمی میں سیاست دین پر اور منافقت دنیا پر غالب آئی، ساری توجہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی نذر ہو گئی، جو لوگ باقی رہ گئے ان میں سے کچھ ہندو تمدن کے زیر اثر رہ کر گمراہ ہو گئے، صرف بچے کھچے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے قافلہ میں شامل ہوئے، ہمارا سرمایہ خوب تھا؛ مگر نسل ناخوب تھی، نتیجہ ظاہر ہے آبائی ورثہ بھی کھویا اور کمائی بھی گنوائی، اور مستقبل کو بھی مخدوش بنا دیا۔

میں نے آخری سوال کی اجازت چاہی اور اسے دو طرح سے پوچھا، ایک شکل یہ تھی کہ اگر قیامت کے دن آپ سے پوچھا گیا اے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی

گئی تھی، اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ نا کام تحریکوں کے علاوہ کیا پیش کریں گے؟ اس سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جد و جہد کا انجام دیکھ لیا، اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی طلاقت اور خطابت کا وہی استعمال کریں گے یا آپ کی زندگی بالکل نئی ہوگی؟ شاہ جی یکا یک خاموش ہو گئے، ان کی خاموشی میں آزردگی بھی شامل تھی، میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹوگراف البم سامنے کر دی، شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا:

وہ اٹھتا ہوا ایک دھنوا اول اول　　وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفان صحرا میں اول　　غبار رہ کارواں آخر آخر

چمن میں عنادل کا مسجودِ اول　　اور گیاہِ رہِ گلرخاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل کشش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیئے، یہ بات ۲۷/جون ۱۹۵۹ء کی ہے، دو تین برس بعد میں اور منشی عبدالرحمٰن خان ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے، شاہ جی زندہ تھے تو اپنے سامعین کو کبھی بنجر زمین اور کبھی صحرا اور کبھی قبریں کہہ کر پکارتے تھے، آج ہم ان کے سرہانے خاموش کھڑے تھے، قبر سے آواز آئی، تمہارے تیسرے سوال کا جواب اس روز دے نہ سکا تھا، لو آج سنو، الفاظ اقبال کے ہیں قصہ مسلم ہندی کا اور حاصل ایک عمر کی خطابت کا۔

مسلم ہندی چرا میداں گذاشت　　ہمت او بوئے کرّاری نداشت

مشت خاکش آنچناں گردیدہ سرد　　گرمئ آواز من کارے نہ کرد

ترجمہ: ہندی مسلمانوں نے سیاست کے میدان کو چھوڑ دیا کیوں کہ ان کی ہمت اور جوان مردی میں حیدر کرار کی خوشبو شامل نہیں تھی۔ وہ مشت خاک ایسے سرد ہو گئے کہ میری آواز کی گرمی ان پر کچھ کام نہ کر سکی۔

آواز دوست/۱۳۱

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی　　جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

لئے پھرتے ہیں جس کو خاکداں کے منتشر ذرے　　یہ میری زندگی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

نئی کوئی کہانی جب سناتا ہے جوانی کی　　ہماری ہی پرانی داستاں معلوم ہوتی ہے

ٹھکانہ ہے کوئی حسن جواں کی طبع نازک کا　　ذرا سی بات بھی تو داستاں معلوم ہوتی ہے

سیماب اکبرآبادی

ماہنامہ المناظر پر تبصرہ۔

# افکار اسلاف کی پاسبانی کرنے والا

# روشن چراغ ماہنامہ المناظر

شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی

امام وخطیب مسجد انوار گوونڈی ممبئی

آسمان علم وتحقیق اور فکر وفن پر جن ہستیوں نے اپنی صلاحیتوں اور کارناموں کے روشن نقوش بکھیرے ہیں ان میں تاجدار قلم مولانا مناظر احسن گیلانی کی ذات نمایاں مقام رکھتی ہے، وہ دارالعلوم دیوبند کے ان مایہ ناز فرزندوں میں تھے جن پر بجا طور پر فکر قاسمی فخر کرتی ہے اور کرتی رہے گی، انھوں نے اپنے خوبصورت اور علم ریز قلم سے تحقیق کے دشت سے لیکر ادب کے صحراؤں تک کو سرسبز وشاداب کیا ہے۔

اسلامی علوم کے مختلف موضوعات اور فنون پر ان کی تصنیفات، مقالات اور مضامین کی ندرت وجامعیت، وسعت ومعنویت اور ان کے ادبی اسلوب وانشا پردازی کا تقاضا تھا کہ اہل فن اس کی طرف توجہ کرتے۔

لیکن واقعہ ہے مولانا گیلانی کے فکر وفن کی طرف اس کی شان وحیثیت کے مطابق اہل نظر کی کوئی خاص توجہ نہ ہوسکی، علم وادب کے طالب علموں کے قدم قطار در قطار ان دشت علم میں داخل ہوتے، سیراب ہوتے اور نکل جاتے۔

اس حوالے سے ماضی قریب کی ممتاز اور جلیل القدر ہستی استاذ العلماء حضرت مولانا اعجاز صاحب کی شخصیت کافی حد تک مستثنی نظر آتی ہے کہ انھوں نے مولانا گیلانی کے تعلیمی مراحل میں سے عہد دیوبند کی وہ روداد جو مولانا گیلانی کے قلم سے وجود میں آئی تو تھی مگر مختلف شماروں اور اوراق میں اس طرح منتشر تھی کہ اس سے استفادہ ناممکن تھا، اس روداد کو ''اکٹھا کر کے احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' کے نام سے ایک کتاب کی ترتیب دے دی، اس کارنامے کے بعد پھر یہ راہ تحقیق سنسان ہی رہی۔ منتشر طور کہیں کہیں اس گام پر کسی طالب فکر گیلانی کے قدموں کی آہٹ کچھ اوراق کی صورت

میں ان کی سوانح حیات کی شکل میں سنائی دی مگر منظّم طور پر ان کے علوم و معارف کی تشریح و توضیح کا کارنامہ وجود میں نہ آسکا۔

مولانا فہیم قاسمی گورکھپوری ایک باصلاحیت عالم کے ساتھ ساتھ باذوق قلم کار بھی ہیں، اردو ادب سے ان کا بہت گہرا رشتہ ہے، خصوصا مولانا گیلانی کی علمی و ادبی تحریروں اور ان کی متنوع اور تاریخی فتوحات عشق کی حد تک تعلق وابستگی ہے اسی تعلق کا اثر ہے کہ انھوں نے مولانا گیلانی کے علوم کی تحفیظ واشاعت کی ہمت کی اور ''نقوش گیلانی'' کے نام سے خوبصورت کتاب کو مرتب کرکے حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی مرحوم کے ان فکری خاکوں میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جو ایک عرصہ قبل ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' کی شکل میں جلوہ گر فکر گیلانی کی اشاعت کی طرح ڈالی تھی۔آفریں ہے کہ مولانا فہیم صاحب قاسمی اس سعی مسعود میں مکمل کامیاب بھی ہیں۔

اپنے اس نصب العین اور اہم مقصد کے لیے مولانا فہیم صاحب نے اسی وسیلے اور ذرائع ابلاغ کو اختیار کیا جس کو زمانہ حرف وقلم سے ہمیشہ اہل علم وفن نے استعمال کیا ہے یعنی ماہانہ میگزین کی ترتیب وتشکیل۔اور اس کے پلیٹ فارم سے مولانا گیلانی مرحوم کی علمی، ادبی، اور فکری تحریروں کی اشاعت وتحفظ کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کو قلم وقرطاس سے وابستہ کرکے ان کے اندر اظہار خیال کی قوت وصلاحیت پیدا کرنا۔تاکہ مستقبل میں علمی امانتوں کے تحفظ اور اسلاف کے افکار و کارناموں کی ترویج واشاعت کی راہیں ہموار ہوسکیں۔

ان کے اس بلند مقاصد کو انہیں کی تحریر میں دیکھا جاسکتا ہے جو پہلے شمارے کے ادارتی تحریر میں موجود ہے،، ماہنامہ المناظر کا مقصد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اکابر علمائے دیوبند کی کوثر وتسنیم میں ڈوبی ہوئی تحقیق وتدقیق سے معمور تحریروں کو نسل نو کے سامنے پیش کرنا ہے، نیز جدید باصلاحیت فضلاء پر مشتمل قلم کاروں کی ایسی جماعت تیار کرنا ہے جو اپنے علمی مضامین اور ادبی تحریروں کے ذریعے اصلاح ملت کے ساتھ ساتھ اپنے جولانی قلم کو تیز سے تیز کرسکیں اور قلم سے ان کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوجائے تاکہ وہ مستقبل میں اپنی انقلابی تحریروں سے اسلاف کی طرح ملت مرحومہ کے انحطاط کا کچھ ازالہ کرسکیں۔(المناظر شعبان ۱۴۴۰/ صفحہ ۳/)

عزم کا سرمایہ ان کے ساتھ تھا، امنگ وحوصلہ ان کا رفیق تھا، ہمت ہمرکاب اور جذبات ہمسفر تھے اس لیے بے سروسامانی کے عالم میں ایک سال قبل برقی میڈیا پر انتہائی خوبصورت انداز میں

معیاری مضامین کے ساتھ اہل علم وادب کی خدمت میں پیش کیا، ہر طرف سے تہنیت کے تحفے ملے، مبارکبادیاں نثار ہوئیں، پذیرائی حاصل ہوئی، حوصلے میں قوت پیدا ہوئی، ارادے مضبوط ہوئے اور دل اور روح کو توانائی عطا ہوئی۔

ان صحت مند عناصر نے قدموں کو سمت سفر کے علاوہ منزلوں کی طرف تیز رفتاری کی قوت عطا کردی اور پھر مختصر سی جماعت کے ساتھ یہ کارواں چل پڑا، کئی شمارے نکلے اور علمی وادبی دنیا میں مقبول ہوئے، زیر نظر رسالہ دوسری جلد کا چوتھا شمارہ ہے ''جو شعبان و رمضان'' کے لمحات کو محیط ہے۔

سابقہ شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی وقت کے تقاضے کے مطابق مختلف ادبی، تاریخی، اور علمی وتحقیقی مضامین سے مرصع ہے، جس میں۔ تاریخ کی روشنی میں ملت اسلامیہ کی رہنمائی پر مشتمل مولانا مناظر احسن گیلانی اور مفسر قرآن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کی عقل ودرایت کی روشنی میں تشریح وتوضیح کے علاوہ حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب مرحوم کی امت مسلمہ کے حوالے سے فکر وتڑپ کی پوری تصویر نظر آتی ہے، حیات گیلانی کے نمایاں نقوش بھی اس میگزین کا اہم حصہ ہیں اور مولانا عبدالباری ندوی کی زندگی کے روشن خاکے بھی، رمضان المبارک کی فضیلت واہمیت سے روشناس کرنے والی تحریر بھی ہے اور ملت اسلامیہ کی روشن تاریخ کی روشنی میں خواتین ملت کی جاں نثاری، بے نظیر بہادری کی درخشندہ داستان بھی اس کی وقعت اور اہمیت میں اضافہ کا باعث ہے، جو حاصلِ مطالعہ کے عنوان سے اس شمارے کی زینت ہے۔

غرض اسلامی تعلیمات کے اہم پہلوؤں کی صورت میں قلب وروح میں تازگی پیدا کرنے والا نہایت مفید اور گراں قدر سامان اس میگزین میں موجود ہے، جو وجود کی اصلاح، زندگی کی تعمیر، اسلامی عظمت رفتہ کی دریافت اور اساطین ملت کے حوصلہ بخش کرداروں کی تنویروں کی سوغات فراہم کرتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس رسالہ کو اپنے مطالعے میں لایا جائے اور اس کی حفاظت واشاعت میں ممکن حد اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا جائے، تاکہ اس کے ذریعے سے پھیلنے والی تنویریں سرحدوں سے بے نیاز ہو کر لامحدود ہو جائیں۔

☆-----☆-----☆